باقیاتِ فتاویٰ رشیدیہ

محدث دوراں، افقہ زماں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

کے

ایسے تقریباً ایک ہزار فتاویٰ کا مجموعہ جو فتاویٰ رشیدیہ
میں شامل نہیں اور اب تک غیر مطبوعہ یا ناپید تھے

تلاش، جمع و ترتیب اور حواشی

نور الحسن راشد کاندھلوی

ناشر

حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

کاندھلہ ضلع پربدھ نگر (مظفر نگر) یوپی، انڈیا

toobaa-elibrary.blogspot.com

باقیات فتاویٰ رشیدیہ

محدث دوراں، افقہ زماں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے
تقریباً ایک ہزار ایسے فتاویٰ کا مجموعہ
جو فتاویٰ رشیدیہ میں شامل نہیں اور چند کے علاوہ تمام غیر مطبوعہ اور نہایت
نادر و کم یاب تھے

جمع و ترتیب حواشی اور مقدمہ

نور الحسن راشد کاندھلوی

مزید حواشی وافادات

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دام ظلہ

شیخ الحدیث وصدر المدرسین، دار العلوم دیوبند

ناشر

حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

کاندھلہ، ضلع پربدھ نگر (مظفر نگر) یوپی۔ انڈیا

BAQIYAT-E- FATAWA RASHIDIA

Compiled by, Footnotes & Preface :

Noorul Hasan Rashid Kandhlavi

کتاب : باقیات فتاویٰ رشیدیہ

فتاویٰ : حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

جمع و ترتیب اور حاشیہ مقدمہ وغیرہ: نور الحسن راشد کاندھلوی

کل صفحات:

الف : ابتدا اور فہرست مندرجات

ب: مقدمہ و متعلقات

ج: اصل کتاب مع ضمائم

طبع اول : ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ / مارچ ۲۰۱۲ء

قیمت : تین سو پچاس روپے/350

کمپوزنگ: شہاب الدین قاسمی بستوی، مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ مظفرنگر یوپی

مطبع : اے۔ایس آفسیٹ پرنٹرس، دریا گنج نئی دہلی فون:23244240

ناشر

حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

کاندھلہ، ضلع پربدھ نگر (مظفرنگر) یوپی، انڈیا

Mufti Elahi Bakhsh Academy

MAULVIYAN- KANDHLAD Distt. Parbudh Nagar.247775

Mb:09358667219

حضرت مولانا گنگوہی کا تاریخی فتویٰ

[ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے.......؟]

پس منظر، محرکات، اس فتوے کے مستفتی، قلمی نسخے، طباعتیں متعلقات نیز اس موضوع پر حضرت مولانا گنگوہیؒ کے اور فتاویٰ

ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے، اس کو فقہائے اسلام کی اصطلاح میں دارالاسلام کہا جائے گا یا دارالحرب، یا ایک نسبۂ متاخر اصطلاح کے مطابق دارالامن! اس کے دارالاسلام سے دارالحرب تک اور دارالحرب سے دور حاضر کی روایات تک پہنچنے میں، کیا حالات و محرکات کارفرما ہے اور کس کس دور میں کون کونسے علماء نے کیا رائے ظاہر فرمائی۔ نیز حضرت مولانا گنگوہی کے، اس موضوع پر مشہور فتوے اور رائے کا پس منظر کیا ہے، اس اہم فتوے کے محرک کون صاحب ہوئے تھے، اس فتوے اور اس موضوع پر، حضرت مولانا گنگوہی کی بعض اور تحریرات میں کیا مناسبت و اختلاف ہے، اس سے واقفیت کے لئے، چند معروضات ضروری ہیں۔

برصغیر ہند میں اسلامی حکومت کا قیام: برصغیر ہند میں پہلی اسلامی حکومت محمد بن قاسم (۱) کی فتوحات کے نتیجہ میں قائم ہوئی تھی، جس کی حدود دریائے سندھ کے کناروں یا پنجاب کے بعض سرحدی علاقوں تک محدود تھیں۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی کے آغاز میں، محمود غزنوی کی ملک گیر فتوحات سے اس کا دائرہ وسیع ہوتا ہوا، برصغیر کے اکثر حصوں تک جا پہنچا، مگر اس کے نتیجہ میں برصغیر میں باقاعدہ مسلم حکومت یا ایسا نظام مملکت قائم نہیں ہوسکا تھا، جس کو باقاعدہ حکومت یا اسلامی نظام کہا جاسکے۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری پہلے حکمراں ہیں، جن کی تراوڑی (کرنال، ہریانہ) کے میدان میں تاریخ ساز جنگ اور فتوحات سے، اس ملک میں اسلامی مملکت اور نظام حکومت کی بنیاد استوار ہوئی، غوری کے مفتوحہ علاقہ کو، غوری کے برگزیدہ نمائندے [قطب الدین] ایبک نے بہت شان اور وقار کے ساتھ سنبھالا اور غوری کی قائم مقامی کا فرض پوری طرح ادا کیا، غوری کی ملحدین کے ہاتھوں (۱۷/ذی قعدہ ۶۰۲ھ/۲۵/جون ۱۲۰۶ء) کو شہادت کے بعد ایبک باقاعدہ تخت نشین ہوا، اس وقت سے برصغیر میں مسلم حکومتوں کا جو آغاز ہوا تھا، وہ مختلف قسم کے حالات،

(۱) مشہور ہے کہ سندھ میں قیادت کے وقت محمد بن قاسم صرف سترہ سال کے تھے مگر یہ روایت و اطلاع صحیح نہیں، محمد بن قاسم سنہ ۶۲ھ (۶۸۱ء) میں تولد ہوئے، سندھ سنہ ۹۳ھ میں فتح ہوا، اس طرح فتح سندھ کے وقت محمد بن قاسم کی عمر تقریباً اکتیس سال ہونی چاہئے۔

جنگوں، بغاوتوں، خاندانوں اور اختلافات سے گذرتا ہوا، اس وقت تک جاری رہا، جب قلعۂ معلّیٰ دہلی کے آخری برائے نام حکمراں، بہادر شاہ ظفر انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار کرلئے گئے اور تخت دہلی کا نام ونشان مٹ گیا۔

ترواوڑی کی جنگ (۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء) سے بہادر شاہ ظفر کی برخواستگی (۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء) تک تقریباً سات سو سالہ مسلم دور حکومت میں، تقریباً ستاون افراد سریر آرائے حکومت ہوئے، جس میں مشکل سے چھ یا سات حکمراں ایسے تھے، کہ جن کو دین اسلام اور قانون شریعت کی بالادستی کا خیال تھا، انہوں نے باضابطہ اسلامی نظام حکومت قائم ونافذ کرنے کی کوشش کی تھی اور اسلام کے طریقہ حکمرانی اور عدالت وانتظام میں، اسلامی اصولوں کو بہر صورت کارفرما کرنے کے، احکامات جاری کئے تھے۔ ان کے علاوہ اکثر حکمراں، صرف رسمی طور پر مسلمان اور ایسی حکومتوں کے سربراہ تھے، جن کو مسلم حکومت کہا جاتا تھا، ان کو نہ اسلام عزیز تھا، نہ اس کا نظام عدل وانصاف پسند تھا، وہ صرف اپنی حکومت اور اختیارات کے طالب وجویاں تھے، اس میں اسلام اور قوانین اسلام کی، کیسی ہی خلاف ورزی اور مخالفت ہو، ان کو اس کا بہت کم احساس ہوتا تھا، مگر اس لمبے عرصہ میں، غالباً کبھی اس پر واضح بحث وگفتگو نہیں ہوئی، کہ آج کل فلاں شخص نظام حکومت پر مسلط ہے، اس کے جاری کئے ہوئے قوانین وضوابط، دین شریعت کی اساس پر نہیں ہیں، وہ خود بھی اسلامی قوانین واصول کی پابندی نہیں کرتا، نہ ان کو پسند کرتا ہے، نہ ہی اس کا ان کے مطابق قانون ونظام نافذ کرنے کا خیال ہے، اس وجہ سے اب یہ ملک دارالاسلام نہیں رہا، ایسے حالات میں اس ملک کو صرف دارالامن یا مسلم مملکت کہا جاسکتا ہے، دارالاسلام نہیں، کیوں کہ یہاں اسلام بالادست قوت کی حیثیت سے کارفرما نہیں ہے۔

صرف خسرو خاں کا مختصر زمانۂ اقتدار اور اکبر(۱) کا آخری دور، کہنا چاہئے ہندوستان کے مسلم دور حکومت میں، اس پہلو سے مستثنیٰ ہے کہ اس پر اسی زمانہ میں سخت تبصرے ہوئے، اور اس دور کے اہل قلم اور مؤرخین نے صاف لکھ دیا، کہ ان کی حکومت

---

(۱) یہ دونوں حکمراں جو بظاہر اول اول مسلمان تھے مگر بعد میں اسلام کے بڑے دشمن نکلے۔ خسرو خاں اپنے آقا اور محسن علاؤ الدین مبارک شاہ کو قتل کرکے، جمادی الاخری ۷۲۰ھ کی پہلی تاریخ (۹ر جولائی ۱۳۲۰ء) کو حکومت پر قابض ہوا تھا، اس نے اسلام اور مسلمانوں کی بے آبروی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اس کے مختصر دور حکومت میں دہلی اور اطراف دہلی میں اسلام اور مسلمانوں سے زیادہ بے وقعت کوئی نہیں تھا۔ ضیاء الدین برنی نے اس وقت کی تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے بہت درد کے ساتھ لکھا ہے: ''باز دہلی ہندوانہ شد و مسلمانی رفع و مضمحل گردد'' (۴۱۲) تاریخ فیروز شاہی

خسرو خاں نے اپنے اس نظریہ اور خاص دشمنانہ رویہ کے باوجود اپنے لئے ناصر الدین کا لقب اختیار کیا تھا، اس پر اس دور کے ممتاز شاعر عصامی نے جو شعر کہا ہے وہ ''تمام ہندزنگی کافور'' کی عمدہ مثال ہے۔ یہ شعر خلیق احمد نظامی صاحب نے سلاطین ہند کے مذہبی رجحانات میں (ص ۳۰۵ دہلی) نقل کیا ہے ملاحظہ ہو:

شدہ ناصر دیں بہ ضدش لقب
کہ بودہ است درقمع دیں روز وشب

اکبر نے بھی اپنی اختراع، دین الٰہی کے لئے اسلام کے ارکان اور اعمال وآثار کا نشان مٹادینا ضروری سمجھا تھا۔ اس کی تفصیلات ملا عبد القادر بدایونی وغیرہ مؤرخین نے ذکر کی ہیں۔ بعد کے مؤرخین بھی بدایونی کی تصریحات سے اتفاق کرتے ہیں۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے: ''دین الٰہی اور اس کا پس منظر'' پروفیسر محمد اسلم، وغیرہ۔

اورحرکات سراسر اسلام دشمنی پرمبنی اور عملاً غیر اسلامی حکومتیں ہیں، ان دونوں کے عہد میں اہل اسلام اور مذہب اسلام دونوں پر، جو برا وقت آیا تھا وہ عالم آشکارا، اور ہماری تاریخ کا ایک ایسا المناک باب ہے، جس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

چراغ آخر شب، اورنگ زیب عالمگیر: اکبر کی موت کے بعد [خصوصاً حضرت مجدد الف ثانی کی کوششوں اور شیخ فرید بخاری کی دانش مندانہ حکمت عملی سے] مغل خاندان کے ارباب حکومت واقتدار کو، ہدایت نصیب ہوئی، انہوں نے ایک مرتبہ پھر ہندوستان کے پچھلے حکمرانوں اور اجداد کی روایت کے مطابق، اسلام سے وابستگی اختیار کی اور متعدد کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود، صراط مستقیم اور تعلیمات دین سے ایک حد تک وابستہ رہے۔ اس کیفیت کو عملی استحکام اس وقت حاصل ہوا، جب اورنگ زیب عالمگیر نے زمام سلطنت سنبھالی، اور اپنی مملکت میں نظام شریعت نافذ کرنے اور مملکت کو پوری طرح، اسلام کے راستے پر لانے کی تدبیر کی، ہر چند کہ اورنگ زیب کے دور میں یہ ملک گویا گہوارۂ اسلام بن گیا تھا، اور خود بادشاہ بھی اتنی بڑی مملکت وحکومت کا تاجدار ہونے کے باوجود، سادگی کا مرقع اور اسلامی احکام ونظام کا ایک نمونہ تھا، مگر اورنگ زیب کے تقریباً تیس سال تک، اپنے پایۂ تخت دہلی سے دور رہنے کے سبب، اس علاقہ پر اس کے وہ اثرات نہیں پڑے، جس کی توقع کی جاسکتی تھی۔

اورنگ زیب کے اخلاص، سادہ دینی مزاج وحکومت کے پورے اعتراف کے باوجود، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں، کہ اگر اورنگ زیب نے ان ریاستوں کی بیخ کنی کرنے کے بجائے، دہلی اور اطراف دہلی میں اپنی حکومت کو مستحکم کیا ہوتا، دشمنوں سے حفاظت کی تدبیر کی ہوتی، ملک کو فوجی لحاظ سے ناقابل تسخیر بنانے کا اہتمام، اور مستقبل کی طویل منصوبہ بندی کی ہوتی، نیز اپنے خاندان اور اولاد کی صحیح تربیت پر توجہ کی ہوتی، تو اس کا فائدہ اس سے کہیں زیادہ اور دیرپا ہوتا، جو ان ریاستوں کو فتح کرنے سے ہوا۔

مغلیہ تخت سلطنت کے نااہل وارث اور ان کا عہد ابتلاء: اورنگ زیب کے دہلی سے مسلسل دور رہنے کی وجہ سے، اطراف دہلی اور شمالی ہندوستان میں موجود، ان طاقتوں اور قوتوں کو پھر اکٹھے ہونے ابھرنے کا موقع مل گیا، جو طاقتور مسلم دور حکومت میں، بے دست وپا اور ناقابل تذکرہ ہوگئی تھیں، ان برادریوں اور گروپوں نے، شاید اورنگ زیب کی زندگی میں ہی اپنے ہتھیار تیز کرنے اور اپنے اپنے علاقوں سے، قدم باہر نکالنے کے ارادے کر لئے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، اورنگ زیب کے وارث، اپنے باپ کی صلاحیتوں سے عاری اور ان کمالات سے محروم تھے، جو اقتدار وجہاں بانی کا حرف آغاز ہوتی ہیں۔ حکومت وفرمانروائی کی تمام صلاحیتوں سے محرومی اور توقعات وخواہشات کی زیادتی نے ان کو ایسے اقدامات پر اکسایا، جو نہ صرف ان کی ذات، بلکہ اس خاندان کی حکمرانی کے لئے بر اشگون اور زوال کا نشان ثابت ہوئے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (ذی قعدہ ۱۱۱۷ھ/فروری سنہ ۱۷۰۷ء) کے بعد، ان کے بیٹوں میں تخت نشینی اور وراثت کی جنگ، برادر کشی تک پہنچ گئی تھی، خاندان میں شدید اختلافات اور تفرقہ پیدا ہوا، مملکت کی آبرو اور تخت سلطنت کی عظمت ختم ہوئی اور ان لوگوں کو اپنی حسرتیں پورا کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا، جو خاندان مغلیہ کا زوال اور مسلم حکومت کی تباہی دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ تمام افراد اپنے تیر و تفنگ لیکر میدان میں آئے تھے، جو زور آزمائی اور ظلم و ستم کے بل پر، حکومت واقتدار کو بے بس کر دینا چاہتے تھے، ایسے تمام سازشیوں نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے مغل حکومت اور اس کے علاقوں پر حملے شروع کئے، اپنے علاقوں میں اپنے اپنے نیزوں کی تیزی آزمانے کے بعد، ان کا رخ دوسرے علاقوں کی مسلم آبادیوں اور بستیوں کی جانب ہوا، اور جن علاقوں، بستیوں میں ان کے سبز قدم پہنچے، وہاں وہاں سے انسانیت وشرافت شرمندہ ہوکر رخصت ہوگئی۔ ان کے حملوں اور شر پسندی کی وجہ سے، ہر مسلم بستی ایک مقتل میں تبدیل ہوگئی تھی، ہر محلّہ سے خون کے فوارے بلند ہو رہے تھے اور ہر اک گلی کوچہ میں موجود، خاکستر محلات ومکانات ظلم وبربریت کی ایک علیحدہ داستاں سنا رہے تھے، برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے گھروں علاقوں میں، لہو کی ایسی فروانی اور ابلیسیت کا ایسا عریاں رقص اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

یہ کسی ایک جماعت یا گروہ کے ظلم وتشدد کی بات نہیں تھی، بلکہ اس وقت موجود، کئی اسلام اور مسلم دشمن قوتوں اور گروہوں نے، ایک ہی انداز سے سوچا تھا، ایک ہی انداز سے اقدام کیا۔ یہ بے گناہ مسلمانوں کا خون بہانے، ان کے گھروں کو تاخت وتاراج کرنے کی، ایک لمبی بھیانک اسکیم تھی، جس نے شمالی ہند کے اکثر حصوں کو بے دریغ حملوں، لوٹ مار، قتل وغارت گری، ظلم وجبر، بربریت وسفاکی سے، جہنم کا نمونہ بنادیا تھا۔ اس وقت مغل حکومت بے بس تھی، اس کی طاقت مفقود، استحکام متزلزل تھا اور جاہ ومنزلت دور ماضی کی بات بن چکی تھی۔

حال یہ تھا کہ جس کا جی چاہتا دلی پر چڑھ دوڑتا، جو چاہتا اس کے اطراف میں لوٹ مار کرتا اور رخصت ہوجاتا، جو چاہتا خون مسلم کی ہولی کھیلتا، ان کی بے کسی کا تماشہ کرتا، ان کی آبروؤں کو پامال کرتا اور ان کو گرفتار کرکے لے جاتا، نہ کوئی اس مصیبت کا دور کرنے والا تھا، نہ ان طاقتوں کا مقابلہ کرنے والا۔ یہ ایسے حالات تھے جس میں صاف نظر آرہا تھا کہ اگر کوئی خاص بات پیش نہ آئی، اور ایسا مرد میدان سامنے نہ آیا جو ان ظالم، چیرہ دست قوتوں سے پنجہ آزمائی کرکے، ان کو بے دست وپا کرسکے، تو اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کا وجود خطرے میں ہے۔ اگر ان اسلام دشمن قوتوں کو تاخت وتاراج، قتل وخون ریزی اور خاک وخون کا مشغلہ جاری رکھنے کی، ایسی ہی آزادی رہتی ہے (جیسی اس وقت تھی) تو اس ملک میں مسلمانوں کی آبرومندانہ زیست کا، تصور بھی باقی نہ رہے گا۔ جس ملک میں مسلمانوں کے لئے ایسے حالات ہوں، جہاں اہل ایمان کے لئے زندگی اور ترقی وکامرانی کے سب راستے بند اور تباہی وبربادی کی ہر قوت آزاد وبے مہار ہو، اس ملک اور علاقہ کو دار الحرب کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے......؟؟؟

حضرت شاہ ولی اللہ کا ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فیصلہ یا فتوی اور دوررس تدبیریں:

حالات کی یہ گرفت، یقیناً تمام مسلمانوں خصوصاً علمائے کرام اور اہل دانش وارشاد کو بے چین کئے ہوئے تھی، مگر زمام کاران کے ہاتھ میں نہیں تھی، اس لئے یہ حضرات دن رات کی بے چینی، اضطراب اور کڑھن کے علاوہ غالباً زیادہ کچھ نہ کر سکے۔ اس کشمکش اور سخت ابتلاء کے دور میں، حضرت شاہ ولی اللہؒ وہ پہلے عالم اور مقتدائے عصر تھے، جنہوں نے ظلمت ایام کی اس سیاہ چادر کو چاک کر کے، روشنی اور امید کا آفتاب طلوع کرنے کی کوشش فرمائی تھی، سب سے پہلے حضرت شاہ صاحب نے، اس ملک کو دار الحرب قرار دیا، یہاں جہاد کی ضرورت اور مسلمانوں کی آبرومندانہ زندگی گزارنے کے لئے، ہر طرح کی کوششوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی، بلکہ اس کی بڑی دوررس، ہمہ جہت اور نتیجہ خیز منصوبہ بندی بھی فرمائی۔

حضرت شاہ صاحب، پایۂ تخت دہلی میں جلوہ افروز تھے اور دہلی کے چاروں طرف مختلف سیاسی، علاقائی، مذہبی تنظیموں گروپوں کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو حملے اور یلغار ہو رہی تھی، اور اس کے نتیجہ میں ہر لمحہ جو آفت و بربادی آ رہی تھی، اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، معتبر بلکہ ان حوادث کے شکار افراد سے اس کی تفصیل بھی سن رہے تھے، اور اس کی وجہ سے نہایت آزردہ خاطر اور پریشان بھی تھے۔ اگرچہ حضرت شاہ صاحب ان افراد میں سے تھے، جن کے لئے عملی اقدام بہت مشکل نہیں تھا، اگر حضرت شاہ صاحب چاہتے تو خود میدان حرب وضرب میں اتر سکتے تھے، لیکن اس وقت مغل خاندان میں بے دانشی اور نفسا نفسی کی جو کیفیت عام تھی، اس میں امید نہیں تھی کہ اس اقدام سے کچھ بڑا فائدہ ہوگا، اس لئے حضرت شاہ صاحب نے اس کا ارادہ نہیں کیا۔ تفہیمات الٰہیہ کی ایک تفہیم میں (ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب اس سے اپنی ذات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں) فرماتے ہیں:

"فلو فرض أن يكون هذا الرجل في زمان واقتضت الأسباب أن يكون إصلاح الناس بإقامة الحروب، ونفث في قلبه إصلاحهم، لقام هذا الرجل بأمر الحروب أتم قيام وكان إماما في الحرب"(۱)

تاہم حضرت شاہ صاحب نے خود کوئی جنگی تنظیم قائم نہیں فرمائی، لیکن ہندی ملت اسلامیہ کو، حوادث کی اس چکی سے بسلامت نکالنے کے لئے، کئی پہلوؤں سے نہایت مفید اور نتیجہ خیز اقدامات کئے۔

حضرت شاہ صاحب نے سب سے پہلے اپنے مکتوبات کے ذریعہ، اس فساد و بگاڑ اور ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کی، حضرت شاہ صاحب کے، متعدد گرامی نامے اس کی تصدیق کر رہے ہیں، کہ ان حالات سے حضرت شاہ صاحب کس

التفهيمات الالهية ص ۱۳۹ جلد اول (بجنور: ۱۳۵۵ھ)

درجہ دل گرفتہ اور رنجور تھے، اس کے لئے کس طرح سوچ رہے تھے اور تدبیریں فرمارہے تھے۔

اگر چہ اس وقت بھی بظاہر مغل حکومت کا نام موجود تھا، لال قلعہ میں بادشاہ بیٹھتے تھے، مگر قلعہ سے باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا تھا، اس پر بادشاہ کی گرفت تھی، نہ قلعہ کے ارباب اقتدار کی۔ بادشاہ خود ایسے بے بس اور پریشان تھے کہ دعا، مشورہ اور تسکین قلب کے لئے، حضرت شاہ صاحب اور دوسرے علماء اور بزرگوں کی خدمات میں حاضری دیتے اور دعاؤں کی درخواست کرتے تھے۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے، کہ بادشاہ وقت، شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر کہتا ہے:

غلبۂ کفر وتفرق رعیت بدرجہ رسیدہ است، کہ معلوم است، چنانچہ خواب وخور بر من تلخ شدہ است، دریں باب دعا مطلوب است۔

کفر کا غلبہ اور رعایا کا اختلاف اس حد کو پہنچ گیا ہے، کہ معلوم ہے، جس کی وجہ میرے لئے کھانا پینا حرام ہو گیا ہے، اس کے لئے دعا کی ضرورت ہے۔

بادشاہ وقت خود کہہ رہا ہے، کہ کفر کا غلبہ ہو گیا ہے مگر میں عملاً بے بس ہوں، اس وقت خود حضرت شاہ صاحب کی کیا کیفیت تھی، اور وہ مسلمانوں کو اس عذاب وآفت سے نکالنے کے لئے، کس قدر بے چین ومضطرب تھے، اس کا حضرت شاہ صاحب کے، مکتوبات گرامی سے اندازہ ہو جاتا ہے، ان میں حضرت شاہ صاحب، اس ملک کو نہ صرف دار الحرب، بلکہ دار الکفر لکھ رہے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کی اس رائے یا فتوے کا نسبۃً وضاحت سے، حضرت احمد شاہ ابدالی کے نام خط سے اظہار ہوتا ہے۔ اس خط میں شاہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

"در ملک ہندوستان غلبہ کفار بایں صورت است کہ درمیاں آمد ضعفِ مسلمانان بایں صفت، دریں زمانہ بادشاہے کہ صاحب اقتدار وشوکت باشد، وقادر بر شکست لشکر کفار، ودور اندیش جنگ آزمائی، غیر از ملازمانِ آنحضرت موجود نیست"

ترجمہ: ملک ہندوستان میں کافروں کا غلبہ اس حد تک ہے، جو سامنے آیا اور مسلمانوں کی کمزوری کی یہ حالت، اس زمانہ میں کوئی ایسا بادشاہ، جو شوکت واقتدار والا بھی ہو، کافروں کے لشکر کو شکست بھی دے سکتا ہو اور دور اندیش بھی ہو۔ جناب والا کے علاوہ [موجود] نہیں ہے۔

اسی خط میں مزید فرماتے ہیں: "ہمت باہمت را بجانب جہاد کفار ایں نواحی مصروف فرمایند" (۱)

ترجمہ: اپنی عالی اقتدار والی ہمت کو، اس علاقہ کے کافروں سے جہاد کی طرف مشغول فرمائیں۔

اور یہ بالکل واضح ہے، کہ جہاد یا مسلم حکومت ومملکت سے نہیں ہو سکتا، جہاد کے لئے اس ملک کا دار الحرب یا دار الکفر ہونا

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ خلیق احمد نظامی صاحب ص: ۱۱/۱۲ (دہلی: ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۹ء)

ضروری ہے۔ اس مکتوب کے ابتدائی سطور بھی اہم اور بڑی معنی خیز ہیں تحریر ہے:

"وجہ بادشاہان اسلام نعمتے است بغایت عظیم، وموجب نصیب بادشاہان دو چیز است، یکے کسر شوکت کفار وظہور ملت اسلام۔ تا وقتے کہ بادشاہان اسلام جہاد نکنند و بجنود اسلام دولت کفار برہم نہ زنند، زمین خدائے تعالیٰ دار الاسلام نگردد، کفار بر ضعفائے مسلمین تاختہ، جان ومال ایشاں بر باد فنا دہند" (۱)

ترجمہ: عالی مرتبت بادشاہوں کی موجودگی بہت بڑی، نہایت عظیم نعمت ہے اور بادشاہوں کا مرتبہ بلند کرنے والی دو چیزیں ہیں، کافروں کی شوکت وقوت کو توڑنا اور ملت اسلام کو نمایاں کرنا، جب کہ سلاطین اسلام جہاد نہ کریں اور اسلامی لشکروں کے ذریعہ سے کافروں کا غلبہ ختم نہ کریں، اللہ کی زمین دار الاسلام نہیں ہو سکتی۔ کافر کمزور مسلمانوں پر حملے کر کے، ان کے جان اور مال فنا کی نذر کر رہے ہیں۔

راقم سطور کا خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحب کا یہ گرامی نامہ سنہ ۷۲-۱۱۷۱ھ (۱۷۵۸ء) کا لکھا ہوا ہے، کیوں کہ ۱۷۵۹ء (۱۱۷۲ھ کے نصف ثانی) میں، احمد شاہ ابدالی ہندوستان آ گیا تھا۔ اسی سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا، کہ حضرت شاہ ولی اللہ سنہ ۱۸۵۷ء سے، سو سال پہلے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فیصلہ فرما چکے تھے۔

حضرت شاہ صاحب نے نواب عبید اللہ خاں کشمیری کے نام، گرامی نامہ میں بھی (جو بظاہر، مذکورہ بالا خط کے بعد لکھا گیا ہے) اس وقت کے ہندوستان، کو صاف دار الکفر لکھا ہے۔ تحریر ہے:

"رقیمہ سامیہ رسید، واستفسارے کہ از اقامت در دیار جٹ کردہ بودند، معلوم شد

عزیز القدر! از غیب بر دل جمع مکرر داعیہ دعا باستیصال ہر دو فریق فرود می آید۔ زینہار در میان ایشان نباید بود، خبر شرط است، اگر دریں ایام عزم حج کنند از ہمہ بہتر، ہم در دنیا وہم در آخرت، اگر میسر نشود، انتقال از دار الکفر خود ضرور است" (۲)

ترجمہ: گرامی نامہ پہنچا اور سوال جس میں جاٹوں کے علاقہ میں قیام کے متعلق دریافت کیا ہے، معلوم ہوا۔ میرے عزیز! غیب سے ان دونوں فریقوں کے خاتمہ کی، اہتمام سے دعا کا دل پر بار بار تقاضہ ہوتا ہے، [اس لئے] ہرگز ہرگز ان کے بیچ میں نہ رہنا چاہئے، اطلاع ضروری ہے۔ اگر ان دنوں میں حج کا ارادہ کر لیں، تو سب سے بہتر ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اگر حج کے لئے جانے کا موقع نہ ہو، تو دار الکفر سے نکل جانا خود بھی ضروری ہے۔

---

(۱) یہ کلمات حضرت شاہ صاحب کے مکتوب بنام ابدالی کی ابتدائی سطور ہیں ملاحظہ ہو، مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ حصہ دوم۔ نسخہ مؤلف مرتبہ ومکتوبہ شاہ محمد عاشق پھلتی۔ مگر معلوم نہیں کیوں یہ فقرے اور کلمات نظامی صاحب نے سیاسی مکتوبات میں شامل نہیں کئے۔

(۲) سیاسی مکتوبات صفحہ ۲۷ (دہلی: ۱۹۶۹ء) پروفیسر نظامی نے سیاسی مکتوبات میں دار الکفر کا ترجمہ ہی نہیں کیا، سیاسی مکتوبات میں صرف یہ مبہم ترجمہ ہے: اگر ممکن ہو سکے تو وہاں سے منتقل ہونا ضروری ہے۔۔۔ صفحہ ۱۵۸۔

حضرت شاہ صاحب اور ہندوستان کے چند، اور بڑے علماء کی گذارشات پر، احمد شاہ ابدالی نے خاطر خواہ توجہ کی اور حضرت شاہ صاحب کے متوسلین نے بھی، ان ہدایات وخطوط کی تعمیل میں فخر ومسرت محسوس کی، احمد شاہ ابدالی حضرت شاہ صاحب کے مکتوب نیز علمائے ہند کے چند اور مکتوبات اور دعوت ناموں کی وجہ سے ہندوستان آیا، اور پانی پت کے میدان میں، ایک طاقتور اور بھرپور حملہ کرکے، ان قوتوں کے ہندوستان پر قبضہ اور حکومت کے منصوبہ پر ایسی کاری بھرپور ضرب لگائی اور ان طالع آزماؤں کو ایسا کمزور اور بے دست وپا کردیا، کہ وہ سر اٹھانے کے لائق نہ رہے۔

ابدالی ربیع الاول سنہ ۱۱۷۳ھ (یکم نومبر ۱۷۵۹ء) کو پانی پت کے میدان میں پہنچا اور تقریباً ڈھائی مہینہ تک جنگ کے بعد، اواخر جمادی الاول (۱۴/جنوری ۱۷۶۱ء) مرہٹوں کو شکست فاش دی۔

حضرت شاہ صاحب کی، یہ تدبیر بلاشبہ نہایت کارگر ثابت ہوتی، اگر ابدالی کی تاریخی کامیابی کے بعد، ہندوستان کی سیاسی قیادت اور وزارت عظمیٰ، حضرت شاہ صاحب کے معتمد افراد میں سے، نواب نجیب الدولہ [جو اپنے جنگی تجربہ، دوراندیشی، بے مثال دانش مندی اور حوصلہ کی وجہ سے، احمد شاہ ابدالی کے لئے بھی ایک دریافت کی حیثیت رکھتے تھے] کے سپرد کردی جاتی، تو بعد کے حالات اس سے، بہت مختلف ہوتے، جو سامنے آئے، ممکن تھا کہ اس سے مغل خاندان اور حکومت کی عمر میں بھی، خاصا اضافہ ہوجاتا، ابدالی کی بھی یہی رائے تھی، لیکن درباری سازشوں، مغل خاندان اور امراء کے باہمی سخت اختلافات اور عہدہ ومنصب کے خواہشمندوں کی، شاطرانہ چالوں نے، اس انتظام کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ نجیب الدولہ کی جگہ ایک اور، وزیر اعظم منتخب کرلیا گیا، جس کا انجام معلوم ہے۔ مغل خانوادہ کے ارباب اقتدار کی بے دانشی اور صبر واعتماد کے فقدان کی وجہ سے، بات پھر وہیں آ گئی جہاں سے چلی تھی، کہ نہ حاکم کو استحکام حاصل تھا، نہ حکومت کو۔ جو دیانت وانصاف، دوراندیشی واستحکام کی بات کرتا، اس کو خودغرض ومطلب پرست کہا جاتا، اہل غرض اور خوشامدیوں کو حکومت وامراء کا مخلص ومددگار سمجھا جاتا تھا۔ اس خودغرضی اور افراتفری کی وجہ سے، بادشاہ اور سربراہان حکومت ایک تماشہ بن کر رہ گئے تھے، کبھی کسی کو حکومت سپرد کی جاتی، کبھی کسی اور کو! آج ایک شہزادہ تخت پر بیٹھتا کل دوسرا، اس کی جگہ لے لیتا، یوں حکومت کا اعتبار اور مغل خاندان کی رہی سہی ساکھ بھی خاک میں مل گئی تھی۔

انگریز بہت دنوں سے اس کھیل کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا، اور اس سے صحیح وقت پر بھرپور فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھا۔ اپنی شطرنج کی بہت عیاری کے ساتھ بساط بچھا چکا تھا، اس کے مہرے حرکت میں تھے، لال قلعہ پر قبضہ ان کی بنیادی ترجیحات میں شامل تھا، بالآخر، انگریزوں نے سنہ ۱۸۰۳ء میں دہلی پر باقاعدہ قبضہ کرلیا۔ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کی عظمتوں کے نام لیوا اور تخت سلطنت کے دعویدار، انگریزوں کی ماہانہ پنشن پر گزارہ کرنے لگے اور ان کے اشارہ چشم وابرو کے محتاج ہوکر رہ گئے۔ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ!

شاہ ولی اللہ کے معاصر بڑے علماء اور ان کے وابستگان کے فتاویٰ: حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے دور کے حالات دیکھ کر، اس ملک کی مذہبی شرعی حیثیت کے متعلق، جو رائے ظاہر فرمائی تھی، تقریباً وہی رائے حضرت شاہ صاحب کے نامور معاصر، حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی بھی تھی۔ ان دونوں کی وجہ سے، بلکہ حالات کی اس گرفت کی وجہ سے، جس کے اثرات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے، ان دونوں کے بڑے طاقتور جانشینوں اور نمائندوں کی بھی، یہی رائے اور فتویٰ تھا کہ موجودہ حالات کی وجہ سے، ہندوستان قطعی طور پر دار الحرب ہے۔ ان حضرات میں سے جو اس رائے کے قائل علم وبردار تھے، ان میں حضرت مرزا مظہر کے نمائندہ اور علمی جانشین، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور حضرت شاہ ولی اللہ کے برگزیدہ اخلاف کرام شامل تھے۔ جس میں حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ رفیع الدین، نیز اس خاندان کے مہر منیر، حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید، مولانا عبدالحی بڈھانوی اور مولانا شاہ محمد اسحاق کے علاوہ، حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مفتی شرف الدین رام پوری (۱) وغیرہ کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ ان ہی فتاویٰ اور نظریات کی وجہ سے اور خاندان ولی اللہی سے وابستہ، مختلف خطوں میں مقیم درجنوں علماء اور اہل ارشاد ومعرفت نے بھی، اسی قسم کے فتاویٰ تحریر فرما کر، اپنے اکابر کی راہ پر چلنے کا عہد کیا اور اپنے عملی اقدامات سے ان فتاویٰ کی توثیق وتصدیق کی۔ ایسے فتاویٰ کی خاصی تعداد ہے، جن کے فوائد واثرات مختلف حیثیتوں سے ظاہر ہوتے رہے۔

کیا یہ فتوے صرف انگریز کے لئے تھے؟ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے، کہ جب علماء کے ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے کے، ابتدائی فتاویٰ کا تذکرہ آتا ہے اور برصغیر ہند کی دینی علمی سیاسی تاریخ پر، ان کے اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے، تو عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ، ان حضرات کی یہ جدوجہد اور کوشش، انگریزوں اور صرف انگریزوں کے خلاف تھی، اور یہی ان حضرات کے سیاسی نظریات کا بنیادی نقطہ اور مقصد تھا، مگر اس خیال کے لئے کوئی علمی بنیاد موجود نہیں۔ ان حضرات کے فتاویٰ دراصل ان تمام طالع آزما قوتوں، اور ظلم وجبر کی ایسی تمام طاقتوں کے بڑھتے اثرات کی وجہ سے صادر ہوئے تھے، جنھوں نے انگریز کے اس خطہ میں آنے سے پہلے، یہاں مسلمانوں کا جینا حرام کر رکھا تھا، جن کی وجہ سے مسلمانوں کی آبرو اور جان مال کو ہر وقت خطرہ رہتا تھا، جب جس کا جی چاہتا ان کے مردوں کو قتل کرتا، ان کی عورتوں کو بے آبرو کرکے، ان کے مکانات کو نذر آتش کر دیتا تھا، ان حضرات کے پہلے اور بنیادی فتوے، ان ہی لوگوں کی وجہ سے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی تحریروں میں اس کی صراحت ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز کے فتاویٰ میں بھی، اس کے اشارات مل جاتے ہیں، اس لئے ان تمام فتاویٰ کو صرف انگریزوں کے حکومت واقتدار سے وابستہ کرنا، دیانت وانصاف نہیں، لیکن یہ صحیح ہے کہ شمالی ہندوستان، خصوصاً دہلی پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد، ان فتاویٰ کا رخ انگریز کی جانب ہوگیا تھا، کیوں کہ وہ

(۱) ان میں چند فتاویٰ معلوم ومطبوعہ ہیں لیکن اکثر غیر متعارف اور غیر مطبوعہ ہیں جس میں سے چند کی اصل باقی کے فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں۔

فکر ومزاج میں، ان قوتوں سے کسی طرح مختلف نہیں تھے جنھوں نے انگریزوں کے آنے سے پہلے، مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیا ہوا تھا، انگریزوں کے بھی ملک گیری کے وہی منصوبے تھے، وہ بھی مسلمانوں کو زیر کر کے، مبتلائے آلام دیکھنا چاہتے تھے، جس کا انگریزوں سے پہلے یہاں موجود مسلمانوں سے معرکہ آرا قوتیں، اظہار و تجربہ کرا چکی تھیں۔ مگر اس وقت برصغیر کے مسلمان اور مملکت ہند جن مسائل و مشکلات کا شکار تھی، اس کا حل صرف فتوے لکھنے سے ممکن نہیں تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ مسلمان میدان میں آ کر عملی جدو جہد کریں، یہی وہ خیال اور منصوبہ تھا، جو اولاً تحریک سید احمد شہید کی صورت میں، دوبارہ ۱۸۵۷ء کی جدو جہد میں پوری شان سے ظاہر ہوا۔

اگر چہ ان دونوں تحریکات کے جنگی میدانی منصوبے ناکام رہے اور ان سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہوئے، جن کے لئے ان کا انتظام کیا گیا تھا، لیکن ان کے معنوی فوائد بے شمار ہیں، اس وقت سے آج تک ان تحریکات کے رہنماؤں اور مقاصد سے دلچسپی برقرار ہے، اور ان کے مخلص رہنما، قوم و ملت کے لئے نشان راہ کی حیثیت سے، جانے پہنچانے جاتے ہیں۔ مگر یہ بھی ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ، اس جدو جہد، خصوصاً ۱۸۵۷ء کی تحریک سے، جو نقصان ہوا تھا وہ ناقابل تلافی ہی رہا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک سے ملکی قوتوں کو استحکام تو کیا ملتا، ملکی اشخاص مسلمان ہوں یا غیر مسلم، ان حقوق و مراعات سے بھی محروم ہو گئے، جو ان کو انگریزوں کے ۱۸۵۷ء سے پہلے کے نظام میں حاصل تھیں۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک کے بعد، مغلوں کا برائے نام اقتدار اور قلعۂ معلّٰی کی حکمرانی بھی گزرے وقت کی داستان، اور ملک کی تاریخ کا ایک الم ناک باب بن گیا۔ ملک و ملت کی تباہی و بربادی جو کیفیت ہوتی وہ محتاج بیان نہیں۔ لاکھوں لاکھ افراد کو سزائے موت ہوتی، پھانسیاں دی گئیں، یہاں سے ہزاروں لاکھوں افراد کو ہجرت کرنی پڑی، ہجرت، جلاوطنی، کالے پانی کی سزائیں برداشت کیں، تاحیات قید کی نہ ختم ہونے والی اذیت اس کے علاوہ تھی: اور

گھر میرا جو جلتا تھا کچھ لوگ یہ کہتے تھے
کیا آگ سنہری ہے، کیا آنچ سہانی ہے

۱۸۵۷ء کے بعد کے دور استبداد کے تلخ تجربات:

۱۸۵۷ء کی تحریک کے بعد، انگریز اس پورے برصغیر پر قابض ہو گئے تھے، ان کی حکومت ہر سیاہ و سفید کی مالک اور جبر و استبداد کے ہتھیاروں سے مسلح، ایک ایسی جابرانہ اور قاہرانہ قوت تھی، کہ اس کے خلاف آواز نکالنا، بلکہ دم مارنا بھی آسان نہیں تھا، اس لئے اس بڑے معرکہ، ملک و ملت کے لاکھوں افراد کی جانوں کی قربانی اور بے شمار آلام و مصائب برداشت کرنے کے باوجود بھی، امتحان باقی رہا اور اس ملک کی شرعی حیثیت میں کچھ تبدیلی نہیں آئی، برصغیر ہند ۱۸۵۷ء کی تحریک سے پہلے جس طرح دارالحرب تھا، اب بھی

اسی طرح رہا، بلکہ ان حالات وحوادث نے، اس کی شدت اور قہرناکی میں کچھ اضافہ ہی کر دیا تھا۔

فکر و عمل کا ایک اور میدان: یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کی مسلح جدوجہد کے بعد علماء نہ عوام، اس لائق نہیں رہ گئے تھے، کہ حکومت کے سامنے دوبارہ اڑ سکیں، اور اپنے حقوق اور معاملات کے لئے، کوئی بڑا میدانی منصوبہ عمل میں لاسکیں، لیکن جہاں تک رائے اور نظریہ کی بات تھی، اس میں کچھ تبدیلی نہیں آئی تھی، اس لئے اکثر علمائے ہند، خصوصاً خاندان حضرت شاہ ولی اللہ سے وابستہ اور اس دینی علمی اصلاحی کارواں سے منسلک، علماء کی وہی رائے رہی، جو ۱۸۵۷ء سے پہلے تھی۔ حضرت شاہ محمد اسحاق کے متعدد شاگردوں، مولانا نواب قطب الدین دہلوی، مولانا عبدالقیوم بڈھانوی، مولانا مفتی محمد ایوب پھلتی اور اس خانوادۂ علم وعمل کے، بڑے دینی علمی نمائندوں میں سے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی وغیرہ اکابر علماء کا، اس پر اتفاق تھا کہ یہ ملک اب بھی اسی طرح دارالحرب ہے، جس طرح اس سے پہلے دور میں تھا۔ لیکن ان حضرات کو ۱۸۵۷ء کے تجربہ نے بتادیا تھا، کہ اب جدوجہد کا میدان بدل گیا ہے، موجودہ حالات میں ہتھیار اٹھانا، ملک میں مسلمانوں کے ٹوٹے پھوٹے بکھرے وجود، اور ان کے رہے سہے دینی کام، علماء اور ذمہ داران کو ختم کرنے، اور اجتماعی خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اس لئے ہتھیار، جنگ کے نظام اور ارادہ کو، وقتی طور پر فراموش کرکے، ملی تعمیر وترقی کے اور کاموں کو اولیت دینی چاہئے، اس کے لئے پہلی بنیادی ضرورت، عوام کی دینی تعلیم وتربیت کے لئے، ایک مرتب ومسلسل نظام اور ایک متعین فکر ومزاج کی تشکیل کی تھی، جس کی روشنی میں آئندہ نسلیں بہترین دینی تعلیم وتربیت، معاملات ومعاشرت کی درستگی ورہنمائی، مستقبل کی بہتر نشو ونما اور اعلیٰ ترین منصوبوں اور دماغوں کی تشکیل کرسکیں، اس مقصد کے لئے ان علمائے کرام نے جو طریقہ اپنایا، واقعہ یہ ہے کہ ان حالات میں، مسلمانوں کی سرفرازی کے لئے، اس سے بہتر تجویز وانتخاب ممکن نہیں تھا۔

یہ اسلامی دینی تعلیم کے لئے، ایسے مدرسوں کا آغاز تھا، جو حکمرانوں اور ارباب دولت وثروت کی نگاہ کرم کے منتظر وپروردہ نہ ہوں، بلکہ ان کی اساس، حق تعالیٰ کے اعتماد اور توکل علی اللہ پر رکھی جائے، ان کا سفر عام مسلمانوں کے تعاون سے آگے بڑھے، اور منزل مقصود تک پہنچے۔ یہ کوشش کچھ ایسی کامیاب ہوئی، کہ اس کے جلو میں دو چار نہیں، پچاسوں سینکڑوں مدرسوں کا جال بچھ گیا، اور یہ مدارس نہ صرف اس خطہ، بلکہ پورے برصغیر اور بعد میں پوری دنیا کے لئے، ایک نمونہ اور ایسی مثال ثابت ہوئے، جس کی اسلامی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں تھی۔

اگرچہ یہ مدرسے اپنے قائم کرنے والوں کی زندگی میں ہی، تناور درخت بن کر سایہ دینے لگے تھے، اور اہل دین کا ایک بڑا طبقہ، ان کی ٹھنڈی چھاؤں میں، دنیا وآخرت کی نعمتوں سے ہمکنار ہونے لگا تھا، مگر اس سب کے باوجود، ان

مدارس کے منصوبہ ساز، اپنے بنیادی مقاصد سے کبھی بھی (کسی) پہلو غافل نہیں ہوئے، انہوں نے اس ملک کے حال اور مستقبل کے نقشہ میں رنگ بھرنے، اس کے دارالحرب ہونے اور آئندہ کے متوقع سیاسی اقدام کے متعلق، اپنی رائے کا تذکرہ جاری رکھا، وہ اس کو اسی طرح دارالحرب کہتے اور لکھتے رہے، جس طرح اس سے پہلے کہتے تھے، ان حضرات میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے بعد، سب سے ممتاز نام حضرت مولانا گنگوہی کا ہے۔

انگریز کے دور میں ملک کی شرعی حیثیت اور سیاسی تحریکات پر حضرت گنگوہی کے فتاویٰ:

حضرت مولانا گنگوہی کے، انگریز حکومت، اس کی شرعی حیثیت اور اس کی ملازمت وروابط کے حوالہ سے، کم سے کم تین فتوے دریافت ہیں، ان میں سب سے پہلا مفصل اور جامع فتویٰ وہ ہے، جو مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی نے ترجمہ کر کے سنہ ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) میں دیوبند سے شائع کیا تھا اور فتویٰ دارالحرب کے نام سے متعارف ہے۔ اس فتوے کا ہندوستان کی دینی علمی تاریخ، خصوصاً سنہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے، سیاسی احوال اور ان کے متعلقات میں بار بار تذکرہ آتا ہے، مگر جب یہ فتویٰ شائع ہوا، اس وقت اس کا سوال اور تاریخ تحریر دریافت نہیں ہوئی تھی، اس لئے ان معلومات ومتعلقات کے لئے تلاش وجستجو کی جگہ، قرائن وقیاسات پر عمارت کھڑی کی گئی، جس کی وجہ سے اس فتوے پر، جو تبصرے ہوئے اور اس کی جو تنقیحات کی گئیں، ان میں کئی روایتیں اور اطلاعات ایسی بھی شامل ہوگئی تھیں، جو صحیح نہیں۔ اس لئے اس کے متن کی نسبۃً قدیم نقل کی جستجو، اس فتوے کی تحریر کا سبب، فتویٰ دریافت کرنے والے عالم کا نام، اور اس کا سنہ تحریر معلوم ہونا بھی بے حد ضروری تھا۔ ان پہلوؤں کی دریافت کے بعد ہی، اس فتوے کی ملی سیاسی تاریخ سے وابستگی اور اس پر اس کے اثرات کا صحیح علم ہوسکتا ہے۔

زیر نظر فتوی اور اس کے متعلق چند مباحث:

آئندہ صفحات میں اس فتوے کا سوال نامہ، اور اس فتوے کا مکمل قدیم ترین معلوم متن پیش کیا جارہا ہے، مگر اس فتوے اور اس کے مفصل سوال نامہ کے مطالعہ سے پہلے، اس موضوع پر حضرت مولانا گنگوہی کے، تینوں معلوم فتووں کے متعلق ضروری معلومات اور ان کے حوالہ سے نقل بعض غلط اور بے اصل اطلاعات کی تحقیق، وتنقیح ضروری ہے، متعلقہ عنوانات یہ ہیں، جس پر آئندہ صفحات میں کچھ گفتگو ہوگی:

(۱) اس فتوے کا زمانہ تحریر اور اس کی تحریک ۱۸۵۷ء سے وابستگی کی، روایات کی حقیقت؟

(۲) حضرت مولانا گنگوہی سے یہ فتوی دریافت کرنے والے عالم کون تھے، ان کے احوال اور مشتبہ اطلاعات پر نظر

(۳) اس فتوے کے قلمی نسخے، ان کے کاتب اور ان کے مندرجات

(۴) اس فتوی کی پہلی طباعت، اس کا ترجمہ، حاشیہ اور توضیحات نگاروں کا تعارف

(۵) حضرت مولانا گنگوہی کے اس موضوع [ہندوستان کی انگریز کے دور میں شرعی حیثیت] پر معلوم چند اور فتوے۔

(۶) زیر نظر نسخہ اور اس کی ترتیب

آئندہ صفحات اسی اجمال کی تفصیل پر مشتمل ہیں۔

اس فتوے کے سنہ تحریر اور اس کے ۱۸۵۷ء سے وابستہ ہونے کی اطلاعات پر ایک نظر: حضرت مولانا گنگوہی کا یہ فتوی، انگریزوں کے دور حکومت میں، ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے موضوع پر، برصغیر کے معروف ترین، چند فتووں میں سے ایک ہے۔ بعض اہل قلم اور مورخین نے اس کا سنہ ۱۸۵۷ء کے واقعات اور تحریک کے مباحث اور اس کے مآخذ میں بھی شمار کیا ہے۔ مثلاً مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے لکھا ہے:

''ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا [گنگوہی] کا پہلا فتوی بزبان فارسی، وشائع کردہ مفتی محمد شفیع صاحب، یا تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے کا ہے، یا اس کے فوراً بعد کا، جب کہ پکڑ دھکڑ بڑے پیمانہ پر جاری تھی'' (۱)

لیکن یہ خیال اور اطلاع صحیح نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی غالباً اس وجہ سے ہوئی، کہ اب تک اس فتوے کا سوال نامہ اور اس کی تاریخ تحریر وسوال معلوم نہیں تھی، صرف یہ معلوم تھا کہ اس کے مصنف ومفتی حضرت مولانا گنگوہی، ۱۸۵۷ء کی تحریک کے قائدین وعمائدین سے تھے، لہٰذا یہ خیال کرلیا گیا کہ حضرت مولانا نے، یہ فتوی اس تحریک کے دوران، یا اس کے بعد لکھا ہوگا، لیکن اب جب کہ اس کے سوال اور جواب دونوں کی تاریخیں اور سن تحریر صحیح طور پر معلوم ہوگئے ہیں، اس غلط فہمی کی کوئی وجہ نہیں۔

یہ فتوی تحریک سنہ ۱۸۵۷ء کے (سن عیسوی کے حساب سے) پورے چھتیس سال بعد، وجود میں آیا تھا، اس کے محرک مولانا سعید الدین بن وحید الدین رام پوری [رام پور منہیاران ضلع سہارنپور یوپی] تھے۔ مولانا سعید الدین نے، جو اس وقت سعید آباد، متھرا میں ملازم ومدرس تھے، حضرت مولانا کی خدمت میں، رمضان المبارک ۱۳۱۰ھ میں ہندوستان کی اس وقت کی شرعی حیثیت کے متعلق، ایک مفصل سوال نامہ ارسال کیا تھا، حضرت مولانا نے اس کا مفصل جواب لکھا، جو ۷ رشوال ۱۳۱۰ھ [۲۴ اپریل ۱۸۹۳ء] کو مکمل ہوا اور یہ عجب حسن توارد ہے، کیوں کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک کا بھی ۲۴ اپریل کو آغاز ہوا تھا۔

لہٰذا اس فتوے کا ۱۸۵۷ء کی تحریک اور اس کے واقعات دونوں سے کچھ تعلق نہیں، اس کو ۱۸۵۷ء سے وابستہ کرنا اور اس ضمن میں، اس کا تذکرہ، درست نہیں۔

(۲) اس فتوے کا مولانا سعد الدین کشمیری سے کچھ واسطہ نہیں: اس کے پہلے مرتب وناشر، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی کو نہ اس کا سوال نامہ ملا، نہ ہی حضرت مفتی صاحب نے اس کا کسی رخ سے کچھ تذکرہ کیا، کہ حضرت

(۱) نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت مجموعہ مؤلفات ص: ۴۳ (علی گڈھ: ۱۹۶۸ء)

مولانا گنگوہی سے یہ سوال کس نے کیا تھا،اس موضوع پر سب سے پہلے مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی نے،اپنی تالیف ''علمائے حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے''میں(۱)وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ

''چنانچہ مولانا سعد الدین صاحب کشمیری اور مولانا امان اللہ صاحب کشمیری نے،ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے متعلق،حضرت مولانا گنگوہی سے استفتا کیا(۲)

لیکن مولانا محمد میاں صاحب کے اس فقرہ میں شامل،دونوں اطلاعات غلط اور بے ثبوت ہیں۔وہ عالم جنہوں نے حضرت مولانا گنگوہی سے،ہندوستان کی شرعی حیثیت کے حوالہ سے،مفصل سوال کیا تھا اور جس کے جواب میں حضرت مولانا نے یہ مشہور فتویٰ تحریر فرمایا تھا،ان کا نام،سعید الدین تھا،سعد الدین نہیں اوران کا وطن سہارنپور کا ایک قریبی قصبہ،رام پور،منہیاران(ضلع سہارنپور،یوپی)تھا،اس لئے اس فتوے کا مولانا سعد الدین کشمیری سے انتساب بے جا ہے۔اگرچہ مولانا امان اللہ کشمیری اور مولانا سعد الدین کشمیری دونوں،حضرت مولانا گنگوہی کے شاگرد تھے(۳)مگر جہاں تک معلوم ہے،ان دونوں کا اس فتوے سے کچھ تعلق نہیں،مگران دونوں کی علمی دنیا میں بوجوہ شہرت تھی،شاید اسی شہرت کی وجہ سے مولانا محمد میاں صاحب کو یہ مغالطہ ہوا۔

---

(۱)علمائے حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے،دوحصوں پر مشتمل ہے،پہلے حصہ کے خاتمہ پر،تالیف کی تاریخ اختتام،۲۲رستمبر۱۹۳۹ء(۷رشعبان۱۳۵۸ھ) درج ہے۔ص:۳۰۴جلد اول(الجمعیۃ بک ڈپو دہلی:بلاسنہ)

(۲)علمائے حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے ص:۹۶حصہ اول

(۳)ملاحظہ ہو:تذکرۃ الرشید،فہرست تلامذہ حضرت مولانا گنگوہی ص:۱۹۷حصہ اول۔مولانا امان اللہ کشمیری کا تعارف راقم کی نظر سے نہیں گذرا،مولانا سعد الدین صاحب،قاضی سری نگر کشمیر،کے متعلق چند معلومات دستیاب ہیں:

مولانا سعد الدین کشمیری کے قدیم خاندان قضات کے فرزند تھے،اعلیٰ تعلیم حضرت مولانا لطف اللہ علی گڈھی سے پائی،درس حدیث حضرت مولانا گنگوہی سے اخذ کیا،غالباً مولانا لطف اللہ صاحب سے استفادہ کے بعد گنگوہ حاضر ہوئے تھے،اس سال جب مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی اور مولانا حکیم رضی الحسن بھی گنگوہ میں حضرت سے صحاح ستہ پڑھ رہے تھے،اور دامن مراد پر کر رہے تھے،اسی زمانہ میں مولانا سعد الدین صاحب بھی اخذ فیض کر رہے تھے۔مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے،حضرت مولانا گنگوہی سے شاگردوں میں،مولانا کا بہت مختصر سا ذکر کیا ہے۔لکھا ہے:

''مولوی سعد الدین صاحب بھی گنگوہی دربار کے تعلیم یافتہ ہیں،جو آج کل سری نگر،کشمیری میں قاضی ہیں۔'' تذکرۃ الرشید ص:۱۹۷حصہ اول۔

مولانا سعد الدین صاحب ایک مرتبہ اپنے رفیق درس،مولانا حکیم رضی الحسن کاندھلوی سے ملاقات کے لئے کاندھلہ آئے تھے،مولانا رضی الحسن نے،اپنے روزنامچہ میں ۸محرم الحرام سنہ۱۳۱۴ھ(۲۱راگست ۱۹۲۳ء)کی یادداشت میں،مولانا سعد الدین کے کاندھلہ آنے کی یادداشت لکھی ہے،جو یہ ہے:

''مولوی سعد الدین کشمیری،کہ در دورہ حدیث مقام گنگوہ شریف شریک بود،بعد سی سال ملاقی شد،براہ دہلی آمدند'' [روزنامچہ قلمی حکیم رضی الحسن صاحب]

تحریر میں کچھ سہو ہوا،غالباً اٹھائیس سال بعد ملاقات ہوئی ہوگی۔

علامہ شبلی نعمانی جون ۱۸۹۸ء(صفر۱۳۱۵ھ)کے آخر میں کشمیر گئے تھے وہاں مولانا سعد الدین نے علامہ کی میزبانی چاہی تھی مگر علامہ نے اس کو پسند نہیں کیا،علیحدہ مکان لیکر قیام کیا۔اسی سفر کے دوران علامہ نے اپنی مشہور کتاب الفاروق مکمل کی تھی،جس پر جون ۱۸۹۸ء کی تاریخ درج ہے۔حیات شبلی،علامہ سید سلیمان ندوی ص:۳۳۴(اعظم گڈھ:۱۹۹۹ء)

مولانا سعد الدین صاحب کشمیری کے،حضرت گنگوہیؒ سے دریافت فقہی سوالات اوران کے جوابات،فتاویٰ رشیدیہ میں مختلف مقامات پر درج ہیں۔

بہر حال یہ تو طے ہے کہ، اس فتوے کے مستفتی، مولانا سعد الدین کشمیری نہیں، بلکہ مولانا سعید الدین رام پوری تھے، مگر کونسے سعید الدین؟ کیونکہ اس وقت رام پور میں بھی سعید الدین نام کے دو فاضل تھے، دونوں جید عالم تھے، دونوں فقہ و فتاویٰ سے وابستگی رکھتے تھے، ان میں سے ایک حضرت مولانا گنگوہی کے خاندانی عزیز، حدیث میں شاگرد، مرید و منتسب اور خاص نیاز مند تھے۔ دوسرے تھانہ بھون کے فاروقی خاندان کے فرد تھے، مولانا مفتی عبد القیوم بڈھانوی سے بیعت اور صاحب درس وافادہ شخص تھے۔ اس لئے حتمی اور متعین طور پر یہ معلوم نہیں، کہ ان میں کس نے حضرت مولانا گنگوہی سے، ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق سوال کیا تھا، لیکن قرین قیاس یہی ہے، کہ مولانا سعید الدین خلف مولانا وحید الدین رام پوری نے دریافت کیا ہوگا؟ وہ حضرت کے معتمد اور قریبی اصحاب میں سے تھے، انہی کی حضرت سے خط و کتابت تھی اور دوسرے صاحب کا مستفتی ہونا بھی غیر متوقع نہیں، ان کو بھی دارالحرب کے موضوع سے دلچسپی تھی، اس لئے یہاں دونوں صاحبان کا مختصر تعارف تحریر ہے، ممکن ہے کہ آئندہ کسی ذریعہ سے ان میں سے، کسی ایک کی تعیین ہو جائے، تاہم راقم سطور کا خیال ہے کہ یہ مولانا سعید الدین بن وحید الدین رام پوری ہی تھے۔ فتوی دارالحرب کے سوال نامہ، یا مکتوب مولانا سعید الدین کے آغاز پر، حضرت مولانا گنگوہی کے لئے جو اشعار و کلمات درج ہیں، ان سے بھی یہی تاثر ملتا ہے، کہ یہ تحریر و سوال مولانا سعید الدین (بن حافظ وحید الدین) کا ہوگا، اس لئے ان کے تعارف کو اولیت دی گئی ہے۔

مولانا سعید الدین بن وحید الدین رام پوری: رام پور منہیاران، ضلع سہارنپور (مغربی یوپی) کا ایک پرانا قصبہ ہے، یہاں ایک انصاری خاندان اکبر بادشاہ کے دور میں سہارنپور سے، آ کر آباد ہوا تھا، جس میں علم کا سلسلہ دیر تک چلا (۱) اس خاندان کے ایک فرد، مولانا حافظ وحید الدین رام پوری تھے، جو حکیم ضیاء الدین رام پوری کے غالباً چچازاد بھائی بھی تھے۔

حافظ وحید الدین ذاکر شاغل اور باخدا شخص اور حضرت حاجی امداد اللہ سے بیعت تھے، حضرت مولانا گنگوہی سے بے تکلف روابط رکھتے تھے اور حضرت سے استفادہ باطنی بھی کیا تھا، ان کے حضرت مولانا کے نام خطوط سے، حافظ صاحب کی رفعت پرواز کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک خط میں لکھا ہے:

اب سنو! کہ بندہ تم کو اپنے سے عمدہ جانتا ہے، خصوصاً یہ حال جو آپ نے اپنے لکھے، اس سے تو صاف ظاہر ہو گیا، کیوں کہ یہ احوال نصیب بندہ نہیں ہوئے۔ حق تعالیٰ مبارک فرمائے اور بندہ کو بھی حصہ مل جائے۔ آمین! (۲)

---

(۱) اس خاندان کے ہندوستان آنے اور رامپور سہارنپور میں آباد ہونے نیز اس خاندان کے چند ارباب علم و ارشاد کا مختصر احوال "مرآت ناصر نما" (تذکرہ مولانا محمد شفیع ناصر رامپوری) تالیف شاہ فیضان احمد حصہ اول (بریلی: ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء) میں ہے۔

(۲) مکاتیب رشیدیہ مرتبہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ مکتوب: ۱۳۷، ص: ۱۹۸ (طبع اول میرٹھ) مکاتیب رشیدیہ میں حضرت گنگوہی کے حافظ وحید الدین صاحب کے نام چار گرامی نامے شامل ہیں مکتوب: ۹۳ تا ۹۶۔

ایک اور مفصل گرامی نامہ میں فرماتے ہیں:

"اور وہ کیفیت یہ ہے، کہ اپنے آپ کو روبرو مالک معبود کے جانے اور شرم وحیا طاری ہو جائے، اس کا نام حضور اور یادداشت ہے، اسی کو لسان شرع میں احسان کہتے ہیں اور یہی نسبت معتبرہ ہے، کہ چلی آتی ہے۔
جب اس کا ملکہ خوب ہو جائے، تو یہی امر ہے کہ قابل اجازت تلقین کے بناتی ہے اور اس کا ہی نام ذکر قلبی ہے، اور اس سے پہلے سب مقدمات اس کے ہیں۔ مبارک ہو، پھر مبارک ہو! حق تعالیٰ اس میں ترقی فرمائے اور تمکن فرماوے، بہت شکر کی جگہ ہے، بہت بہت شکر کرنا واجب ہے" (۱)

حافظ وحیدالدین صاحب کے احوال وتاریخ وفات وغیرہ معلوم نہیں۔

مولانا وحیدالدین رام پوری نے حضرت حاجی امداداللہ کے مکتوبات کا ایک مجموعہ سنہ ۱۳۰۴ھ (۱۸۸٦-۸۷ء) میں مرتب کیا تھا، حضرت تھانوی نے اس کو اردو ترجمہ مختصر حواشی اور ضروری معلومات کے ساتھ مرتب کر کے، مرقومات امدادیہ کے نام سے، امدادالمشتاق کے ساتھ شامل کر کے ۱۳۴۷ھ میں شائع کر دیا تھا۔ حافظ صاحب کے فرزند مولانا سعیدالدین تھے۔

ولادت اور تعلیم: مولانا سعیدالدین کی تاریخ ولادت معلوم نہیں، نو عمری سے دینی تعلیم کا آغاز ہوا، جب حضرت حاجی امداداللہ کو اس کی خبر ملی، تو اس پر اظہار مسرت کیا، دعاؤں سے نوازا، اور تحریر فرمایا کہ:

"برخوردار احمد وسعید وغیرہ کے عربی پڑھنے سے بھی فقیر کو فرحت ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کو علم نافع اور عمل صالح نصیب کرے اور عمر دراز اور صاحب قدر کرے" (۲)

حضرت کی دعا بارگاہ الٰہی میں منظور ہوئی، اور مولانا سعیدالدین کو وہ تمام نعمتیں حاصل ہوئیں، جن کے لیے حضرت حاجی امداداللہ صاحب نے دعا فرمائی تھی۔

مولانا سعیدالدین، حضرت مولانا گنگوہی کے ممتاز شاگرد اور جید فاضل تھے، مولانا سعیدالدین کے، اسباق دورۂ حدیث شریف کا ۲۱ رشوال ۱۳۰۴ھ (جولائی سنہ ۱۸۸۷ء) میں آغاز ہوا تھا، غالباً شعبان ۱۳۰۵ھ میں درس مکمل ہوا ہوگا (۳) تعلیم سے فارغ ہو کر متعدد مدرسوں سے وابستہ رہے، سنہ ۳٦-۱۳۳۵ھ (۱۷-۱۹۱٦ء) میں بھوپال چلے گئے تھے، بھوپال میں محرر کی حیثیت سے تقرر ہوا، محنت ودیانت کی وجہ سے تیزی سے ترقی ہوتی رہی، آخر میں مہتمم سائر کل، کے اعلیٰ ترین عہدہ تک

(۱) مکاتیب رشیدیہ، مرتبہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ ص: ۹۵ [طبع اول، میرٹھ]
(۲) مرقومات امدادیہ [مشمولہ امدادالمشتاق] مکتوب: ۵۵۔ ص: ۱۱۲۔ مرتبہ حافظ وحیدالدین رام پوری، بحاشیہ مولانا سعیدالدین رام پوری
(۳) آپ بیتی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی ص: ۱۴ طبع اول، (یحیوی سہارنپور ۱۴۷۴ھ)

پہنچے۔ ریاست میں بہت عزت ووقار کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ہر طبقہ کے افراد میں پذیرائی حاصل تھی۔

اگرچہ ملازمت کی مصروفیات بہت رہتی تھیں مگر مولانا نے کہیں بھی قیام ہوا، اور کسی بھی ملازمت وخدمت پر فائز رہے ہر جگہ درس حدیث کا معمول بلاناغہ جاری رکھا، طلبہ کی مالی معاشی سرپرستی فرماتے، ان کی ضروریات کا بھی بہت خیال کرتے تھے، دو چار طلبہ کو اپنے ساتھ کھانے میں شامل رکھتے تھے۔ معروف اہل قلم محمد امین زبیری نے (جنہوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا تھا) لکھا ہے:

"وہ دورے میں ہوں یا مقیم، صبح کے وقت دو چار طلباء کو حدیث وفقہ کا درس، ان کا لازمۂ زندگی تھا، ان کے دسترخوان پر چند طلباء خصوصاً ناشتہ اور شب کے کھانے کے وقت، ضرور ہوتے تھے، وظیفہ یاب ہونے کے بعد بھی یہی نظام اوقات تھا" (۱)

مولانا وحید الدین کے، حضرت مولانا گنگوہی سے جو روابط تھے، مولانا سعید الدین میں اس کا پورا اثر آیا، اور مولانا بھی ہمیشہ حضرت مولانا کے دامن فیض سے وابستہ رہے۔ مولانا سعید الدین کے نام حضرت مولانا کے مکتوبات سے ان روابط اور اعتماد کا اندازہ ہوتا ہے، جو حضرت مولانا کو مولانا پر تھا۔ حضرت مولانا کے گرامی ناموں سے یہ بھی واضح ہورہا ہے کہ مولانا، حضرت کو اپنے تمام حالات ومسائل سے باخبر رکھتے تھے اور حضرت مولانا حسب ضرورت ہدایت ورہنمائی بھی فرماتے رہتے تھے، حضرت مولانا کے مکتوبات کے بعض مندرجات سے، مولانا کے روحانی کمالات ومرتبہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت مولانا نے ایک خط میں تحریر فرمایا ہے:

"اگرچہ تم کو ایسی حالت میں کہ اسباب ظاہری پر نظر نہیں، کچھ لکھنا لغو ہے، مگر تاہم بحکم: **الدین النصحیة** لکھتا ہوں، کہ بار بار زیارت وطن اور بہانہ دلداری خَتَن، تدبیر کے خلاف ہے، اگر حق تعالی نے سامان رزق مقرر کر دیا ہے، اس کو متغیر متنکر بنانا اور پرخاش عباد کا سبب ٹھہرانا قرین مصلحت نہیں، آئندہ جو مناسب جانو" (۲)

دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن: مولانا سعید الدین صاحب کو، حضرت مولانا گنگوہی کی نسبت اور خاندان حضرت مولانا قاسم نانوتوی سے قرابت کی وجہ سے، دار العلوم دیوبند سے والہانہ سا تعلق تھا، دار العلوم میں، حضرت گنگوہی کے سرپرستی کے آغاز کے وقت سے، معمول چلا آرہا تھا کہ رامپور گنگوہ وغیرہ سے خانوادہ کا، کوئی فاضل مدرسہ کی شوریٰ کا رکن بنایا جاتا تھا، سب سے پہلے ممبر، مولانا حکیم ضیاء الدین رامپوری تھے، پھر ان کے بھتیجے، مولانا حافظ احمد رامپوری اس کے لئے نامزد کئے گئے، مولانا احمد کی رکنیت شوریٰ کے، (۳) چار سال بعد ۱۳۲۴ھ میں مولانا سعید الدین بھی مجلس شوریٰ کے لئے

---

(۱) بھوپال کا علمی جائزہ، مضمون از محمد امین زبیری، مشمولہ بھوپال نمبر، فکر وآگہی، دہلی۔ مرتبہ رضیہ حامد صاحبہ ص: ۷۹۱ (طبع اول ۱۹۹۶ء)

(۲) مکاتیب رشیدیہ ص: ۹۲

(۳) دار العلوم کی صد سالہ زندگی، تالیف مولانا قاری محمد طیب صاحب ص: ۱۰۳ (طبع اول دیوبند: ۱۳۸۵ھ)

منتخب کر لئے گئے تھے، جو اس وقت سے وفات تک، بہت دلچسپی اور اہتمام سے، مدرسہ کی بھرپور خدمت کرتے رہے۔

شوریٰ کے اجلاس کا وقت آتا، تو کئی دن پہلے دیوبند پہنچتے، مدرسہ کے معاملات کو دیکھتے، کاغذات کو جانچتے اور مجلس شوریٰ میں رکھنے کے لئے، ان کی ترتیب و تکمیل فرماتے۔ مجلس کی تجاویز لکھنا اور اس کے متعلق تحریری کام انجام دینا، اپنی سعادت سمجھتے تھے اور کئی دن تک اس میں مشغول، وقت گذارتے تھے۔ دار العلوم دیوبند کی روداد میں، مولانا کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"دار العلوم کی خدمت میں شغف کا حال یہ تھا، کہ مجلس شوریٰ کے ہونے سے چند روز بیشتر، آپ تشریف لاتے تھے، اور وہ تمام کاغذات، جو شوریٰ میں پیش ہونے والے ہوتے تھے، آپ ان کو مرتب فرمایا کرتے تھے۔ جلسہ کے دوران میں، تمام روداد شوریٰ کا لکھنا، تجاویز کا مسودہ بنانا اور بعد میں ان کا صاف کرانا، یہ سب کچھ آپ نے اپنے ہی ذمہ لے رکھا تھا، آپ ان تمام کاموں کو عبادت عظمیٰ خیال فرماتے تھے اور اکثر تحدیث بالنعمۃ کے طور پر، اس کا اظہار بھی فرمایا کرتے تھے، اپنا بیشتر وقت دار العلوم کی ان ہی خدمات میں گذارتے تھے" (۱)

اخلاق وعادات ومزاج: علم وفضل، دیانت وسچائی اور خوش خلقی میں ممتاز ومعروف تھے، وسیع القلب تھے، ہر اک فکر وخیال کے افراد سے بے تکلف ملتے اور ضرورت ہوتی، تو نہایت نرمی سے بحث وگفتگو کرتے، تعصب اور شدت مزاج سے بہت دور تھے۔ نصیحت وگفتگو نہایت موثر تھی، دینی ودنیاوی وجاہت سے بہرہ ور تھے۔ محمد امین زبیری صاحب نے، بھوپال کے ممتاز علماء میں مولانا کا ذکر کیا ہے، جو لائق مطالعہ ہے۔ لکھتے ہیں:

علماء کے زمرہ میں، مولوی سعید الدین کو بھی شامل کرنا چاہئے، جو دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ بھوپال میں ان کی پوزیشن، ایک سیویلین افسر کی تھی، انہوں نے محرری سے ترقی کی اور ذمہ دارانہ عہدوں پر مامور رہے۔ وہ دورے میں ہوں یا مقیم، صبح کے وقت دو چار طلباء کو حدیث وفقہ کا درس، ان کا لازمہ زندگی تھا۔ ان کے دستر خوان پر چند طلباء، خصوصاً ناشتہ اور شب کے کھانے کے وقت ضرور ہوتے تھے، وظیفہ یاب ہونے کے بعد بھی یہی نظام اوقات تھا۔

نہایت وجیہ خوش لباس اور نفیس طبع تھے۔ ایسے پیرایہ میں نصیحت کرتے تھے کہ موثر ہو جاتی تھی، وسیع القلب تھے، ہر خیال کے آدمی سے مخلصانہ وبے تکلفانہ ملتے تھے اور نرمی سے بحث کرتے تھے، متعصبانہ ذہنیت کا پتہ نہ تھا۔ شرعی پائجامہ (جس کا کمر بند گلے میں ہوتا یا اس میں پتلون کی گیٹس لگے ہوتے) قمیص، شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے، کبھی کبھی مولویانہ عمامہ اور قبا بھی، بلیرڈ اور کروکے کھیلوں میں مشاق تھے (۲)

---

(۱) روداد دار العلوم دیوبند ۱۳۲۷ھ

(۱) بھوپال کا علمی جائزہ۔ مضمون از محمد امین زبیری۔ مشمولہ بھوپال نمبر۔ فکر وآگہی، دہلی۔ مرتبہ رضیہ حامد صاحبہ۔ ص: ۶۹۱ (طبع اول: ۱۹۹۶ء)

مولانا کا مرتبہ حاشیہ مکتوبات امدادیہ: مولانا کی ایک مختصر سی علمی تحریری خدمت، حضرت حاجی امداد اللہ کے مجموعہ مکتوبات (مرقومات امدادیہ) میں، درج اشخاص کا تعارف ہے۔ یہ مجموعہ مکتوبات، مولانا کے والد، مولانا حافظ وحید الدین رامپوری نے مرتب کیا تھا، حضرت مولانا تھانوی نے مولانا سعید الدین سے، اس میں مذکور شخصیات وعلماء وغیرہ کی تعیین کرائی اور مولانا عبدالحی حیدرآبادی سے، ان مکتوبات گرامی کا ترجمہ کرا کے، مرقومات امدادیہ کے نام سے، امداد المشتاق کے ساتھ شائع فرمادیا۔ مولانا شبیر علی تھانوی نے اس خدمت کا ذکر کرتے ہوئے، لکھا ہے کہ:

"ان مکتوبات میں بہت سے حضرات کے اسمائے گرامی اس طرح آئے ہیں، کہ فہم مضامین، ان کے حالات معلوم ہونے پر موقوف ہے، بناءً علیہ، جناب مولانا سعید الدین صاحب ابن مولانا محمد وحید الدین صاحب، جامع مکتوبات سے، ان حضرات کے مختصر حالات تحریر فرمانے کی استدعا کی گئی، ممدوح نے نہایت خوشی سے اس کو منظور فرمایا(۱)

وفات: مولانا سعید الدین کی بھوپال میں، ۲۴ رذی قعدہ سنہ ۱۳۴۷ھ (۳ مئی سنہ ۱۹۲۹ء) کو وفات ہوئی (۲) وہیں دفن کیے گئے۔ علمی دینی حلقوں میں مولانا کی وفات کا گہرا صدمہ ہوا، مولانا سے جو ایک فیض جاری تھا، اس کے ختم ہونے پر تاسف ظاہر کیا گیا۔ دارالعلوم دیوبند نے، جس کی مجلس انتظامیہ کے، مولانا تقریباً چوتھائی صدی تک رکن رہے، مولانا کی کمی کو بہت محسوس کیا۔ دارالعلوم کی روداد میں مولانا کا تذکرہ ہوا، اور مولانا کی وفات سے مدرسہ کے لئے، جو خلا پیدا ہو گیا تھا، اس کا خاص اہتمام وتذکرہ کیا گیا۔ روداد کا مفصل اقتباس درج ذیل ہے:

اس حادثہ [مولانا احمد نانوتوی، مہتمم دارالعلوم، دیوبند کی وفات] کے چند ماہ بعد ہی، حضرت مولانا سعید الدین صاحب مرحوم، رامپوری مشیر المہام ریاست بھوپال، کی وفات ہوگئی، جس سے مجلس شوریٰ کے کاموں میں، زبردست کمی اور نقصان اہل بصیرت نے محسوس کیا۔ مولانا سعید الدین صاحب مرحوم رامپوری، دارالعلوم کے ان قدیم ممبران میں سے تھے، جو حضرت گنگوہیؒ کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔

آپ کی تمام عمر، مدرسہ کی جان نثاری ہمدردی وخیر خواہی میں گذری۔ اسی کے ساتھ آپ کا علم وفضل، راستبازی، وجاہت دینی ودنیوی، خوش خلقی ومروت، ایسے اوصاف تھے، جن میں آپ یگانہ روزگار سمجھے جاتے تھے۔ اگرچہ آپ کا تعلق بعجہ ریاست بھوپال میں ہونے کے، بظاہر شغل درس وتدریس خاطر خواہ نہ تھا، مگر باوجود اس کے، اس

---

(۱) حاشیہ صفحہ دوم مرقومات امدادیہ (عکس طبع اول: ۱۳۴۷ھ)

(۲) تاریخ کبیر (مفصل تاریخی یادداشت نامہ) تحریر وتالیف، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی، فوٹو اسٹیٹ نسخہ مؤلف۔ مملوکہ راقم سطور

زمانہ میں بھی آپ اس مشغلہ سے خالی نہ رہے، ایک دو طالب علم آپ کے مکان پر حاضر ہوکر، حدیث وتفسیر، اصول فقہ اور فقہ وغیرہ کی، بڑی بڑی کتابیں آپ سے پڑھتے رہتے تھے۔

دار العلوم کی خدمت میں شغف کا یہ حال تھا، کہ مجلس شوریٰ کے ہونے سے چندروز پیشتر، آپ تشریف لاتے تھے، اور وہ تمام کاغذات، جو شوریٰ میں پیش ہونے والے ہوتے تھے، آپ ان کو مرتب فرمایا کرتے تھے۔ جلسہ کے دوران میں تمام روداد شوریٰ کا لکھنا، تجاویز کا مسودہ بنانا اور بعد میں ان کو صاف کرانا، یہ سب کچھ آپ نے اپنے ہی ذمہ لے رکھا تھا، آپ ان تمام کاموں کو عبادت عظمیٰ خیال فرماتے تھے، اور اکثر تحدیث بالنعمۃ کے طور پر اس کا اظہار بھی فرمایا کرتے تھے، اپنا بیشتر وقت دار العلوم کی ان ہی خدمات میں گذارتے تھے۔ فتنۂ اختلاف ۱۳۴۴ھ میں آپ نے جس سرگرمی سے دار العلوم کی حمایت واعانت میں، غیر معمولی حصہ لیا، اس کے لئے القاسم والانصار شورائے مقالی شاہد عدل ہیں، اسی لئے مولانا کی وفات کا صدمہ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ودیگر ارکان مدرسہ، اور تمام جماعت دار العلوم نے، غیر معمولی طور پر محسوس کیا اور واقعہ یہ ہے کہ آپ کی وفات سے، مدرسہ کی اور مجلس شوریٰ کی قوت انتظامیہ، وہیئت ترکیبیہ کو جو نقصان عظیم پہنچا، اس کی تلافی آج تک نہ ہوسکی، فی زمانہ ایسے مخلص کارکن کہاں۔ حق تعالیٰ آپ کی مغفرت فرماکر، آپ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

دار العلوم میں جب آپ کی وفات کا تار پہونچا، طلبہ ومدرسین وملازمین نے ملکر، قرآن خوانی وکلمہ طیبہ کا ختم کرکے آپ کے لئے ایصال ثواب کیا" (۱)

مولانا سعید الدین بن علیم الدین رامپوری: مولانا سعید الدین کے عہد میں، رام پور میں اسی نام کے ایک اور عالم بھی تھے، جو مولانا علیم الدین، بن شیخ احمد بخش کے فرزند، اور تھانہ بھون کے اس معروف فارقی خاندان کے فرد تھے، جس سے تھانہ بھون کے، مشہور علماء اور مشائخ وابستہ ہیں (۲) یہ خاندان سنہ ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں، تھانہ بھون کی بربادی کے بعد، رامپور آکر آباد ہوگیا تھا۔

مولانا سعید الدین کی نسبت مولانا کی تحریروں سے چند مختصری ناتمام معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مولانا سعید الدین، مفتی عبد القیوم بڈھانوی سے بیعت تھے (۳) غالباً کچھ دنوں بھوپال میں بھی قیام رہا تھا، مولانا سعید الدین کو ہندوستان کی

(۱) روداد دار العلوم دیوبند .... سنہ ۱۳۴۷ھ ..... ص: ۱۷۔

(۲) مولانا معیز الدین فاروقی کا، دادھیالی نھیالی نسب نامہ ان اوراق پر مفصل درج ہے، جو مولانا کی مملوکہ شامی [حاشیہ درمختار] کے ساتھ شامل ہیں۔ یہ نسخہ مدرسہ مظاہر علوم قدیم سہارنپور میں محفوظ ہے۔

(۳) مولانا عبد القیوم سے بیعت کا واقعہ، اور مفتی عبد القیوم صاحب کی عنایت کی ہوئی ایک مفصل سند بیعت بھی، مولانا سعید الدین نے اپنی تحریرات میں نقل کی ہے۔ مولانا کی مذکورہ تمام تحریروں کے فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں۔ (نور)

شرعی حیثیت کے مباحث سے دلچسپی تھی، مولانا نے مولانا قاضی محمد ایوب پھلتی کا، رسالہ دارالحرب بھی ۱۳۰۹ھ میں نقل تھا، [یہ نسخہ مظاہر علوم سہارنپور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔] ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) تک حیات تھے۔

مولانا کو فقہ حنفی سے ذوق تھا، شامی پر مولانا کے مختصر اشارات وافادات درج ہیں۔ مولانا کے تعلیم وتلمذ وغیرہ کے متعلق کچھ معلوم نہیں اور مولانا کے حضرت مولانا گنگوہی سے، کسی رابطہ کی بھی ہنوز کوئی اطلاع دستیاب نہیں، اس لئے قرین قیاس ہے کہ، حضرت مولانا گنگوہی کے نام سوال اور مکتوب، مولانا سعید الدین خلف مولانا وحید الدین کا ہے۔ بہ ظاہر موخر الذکر، مولانا سعید الدین (بن علیم الدین) کا اس فتوے سے کچھ تعلق نہیں۔

اس فتوے کے قلمی نسخے: اس فتوے کی اگرچہ تحریر کے فوراً بعد، نقلیں شروع ہوگئی تھیں، خود حضرت مولانا گنگوہیؒ نے اپنے فتوے کے آخر میں تحریر فرمایا ہے: میں یہ مسودہ بھیج رہا ہوں امید کہ اس کی نقل لینے کے بعد، اصل تحریر یہاں واپس بھیج دیں گے، کیوں کہ یہاں بھی کچھ لوگ اس نقل کا ارادہ رکھتے ہیں:

"ایں مسودہ را روانہ می کنم، امید کہ بعد نقلش، روانہ این صوب فرمایند کہ بعض مردم این جا، ہم قصد نقلش می دارند"

حضرت کے تلامذہ اور متوسلین کا معمول بھی یہی تھا، کہ وہ حضرت مولانا کی اکثر اہم تحریروں اور فتاوی کی نقل محفوظ کرنے کی، کوشش کرتے تھے، بہ ظاہر اس پر بھی، متعدد حضرات نے توجہ فرمائی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ حضرت کی وفات کے ایک عرصہ بعد تک، اس کی متعدد نقلیں موجود تھیں۔ مولانا مفتی محمد شفیع نے مطبوعہ نسخہ کی تمہید میں لکھا ہے:

"حضرت کے اقارب وتلامذہ میں، دوسرے متعدد حضرات کے پاس بھی، اس کی نقلیں موجود ہیں"

مگر افسوس کہ اب ان میں سے اکثر نقلیں معدوم اور بے نام ونشاں ہوچکی ہیں، صرف دو قدیم ومعتبر قلمی نسخے معلوم ہیں، پہلا حضرت مولانا گنگوہی کے ایک پرانے شاگرد اور مجاز طریقت، مولانا صادق الیقین صاحب کرسوی (۱) کی باقی ماندہ

---

(۱) مولانا صادق الیقین خلف مولانا سراج الیقین۔ کرسی ضلع بارہ بنکی میں ولادت ہوئی، مولانا حکیم محمد حسین سے متوسطات، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے مدرسہ جامع العلوم کان پور میں درسیات کی اکثر کتابیں اور معقولات پڑھیں۔ کان پور سے کاندھلہ آئے، مولانا حکیم صدیق احمد کاندھلوی نے یہاں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، اس میں پڑھا، (مولانا صادق الیقین کے اپنے والد کے نام خطوط میں اس کی تفصیلات لکھی ہیں، جو راقم نے پڑھے ہیں اور ان کے فوٹو اسٹیٹ میرے پاس موجود ہیں۔) مولانا صدیق احمد کاندھلوی کی رہنمائی میں، حضرت مولانا رشید احمد کی خدمت میں گنگوہ میں حاضر ہوئے، حضرت مولانا سے حدیث شریف مکمل کی۔ حضرت مولانا گنگوہی، مولانا کی لیاقت وذہانت کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔

اول اپنے والد سے بیعت ہوئے، سنہ ۱۳۱۰ھ میں حج کے لئے حاضر ہوئے حضرت حاجی امداد اللہ سے شرف بیعت حاصل کیا، مکہ مکرمہ میں قرأت وتجوید میں کمال حاصل کیا۔ مدینہ منورہ میں شیخ ظاہر علی وتری سے اجازت حدیث اور سند لی۔ مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی سے بھی اجازت وسند حاصل کی۔ حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئے، یہ سفر اصلاح باطن بیعت اور استفادہ کے لئے ہوا تھا، لمبے عرصہ تک حضرت مولانا سے استفادہ کیا اور اجازت وخلافت حاصل فرمائی، اتباع سنت میں نہایت کامل تھے۔

شوال سنہ ۱۳۳۳ھ (ستمبر ۱۹۱۵ء) میں ہجرت کے ارادے سے مکہ معظمہ پہنچے حج کے فوراً بعد ۳ محرم الحرام ۱۳۳۴ھ (نومبر ۱۹۱۵ء) کو مکہ معظمہ میں وفات ہوگئی۔ معلومات کے لئے مولانا کے والد مولانا شاہ سراج الیقین کی مؤلفات: شمس العارفین ۹۳-۹۵ (افضل المطابع ہردوئی) ۱۳۳۳ھ اور سراج وہاج (سفرنامۂ حج، خدا بخش لائبریری جرنل (شمارہ ۷۵-۷۷) نیز مولانا پر راقم سطور نور الحسن راشد کاندھلوی کا مضمون مندرجہ سہ ماہی احوال وآثار، کاندھلہ۔ شمارہ محرم الحرام ۱۴۱۵ھ/ اگست ۱۹۹۴ء، ملاحظہ ہو۔

چند کتابوں میں شامل ہے، دوسرا نسخہ جو علامہ انور شاہ کشمیری کے قلم سے ہے، خانقاہ رحمانیہ مونگیر (بہار) میں محفوظ تھا، اس نسخہ کا عکس مولانا منت اللہ مونگیری نے "ہندوستان اور دارالحرب" کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ دونوں کا تعارف درج ذیل ہے۔

نسخہ کرسی، مکتوبہ ۱۳۲۲ھ: اس فتوے کا خانقاہ نجاتیہ کرسی (ضلع بارہ بنکی) میں موجود نسخہ قدیم ترین معلوم نسخہ ہے۔ یہ ایک مجموعہ [تحریرات ورسائل] میں شامل ہے جو تمام حضرت مولانا گنگوہی کے چند اہم ترین جوابات ومکتوبات پر مشتمل ہے، اس مجموعہ کا تصوف، اصطلاحات تصوف اور مشائخ وصوفیاء کے متعلق، خلیفہ ابو محمد محی الدین کے ایک مفصل سوالنامے اور اس کے نہایت جامع جواب سے آغاز ہوا ہے، اس کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی، حضرت مولانا سے وہ اہم خط وکتابت نقل کی ہے، جو بعد میں تذکرۃ الرشید میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں یہ فتوی اور اس کا سوال نامہ نقل کیا گیا ہے، جو [صفحہ ۳۵ کے نصف آخر سے صفحہ ۴۶ کے اختتام تک] ساڑھے آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، آخری ڈیڑھ صفحہ میں سجدہ غیر اللہ کے سلسلہ میں، مولانا احمد حسن مرادآبادی کے ایک سوال کا جواب نقل ہے، گویا یہ مجموعہ کل سینتالیس صفحات میں ہے۔ تحریر پختہ مگر رواں ہے، "ترقیمہ" کاتب درج نہیں، لیکن صفحہ ۱۷ کے حاشیہ پر یعنی خلیفہ ابو محمد محی الدین۔ کے سوال کے جواب کے اختتام پر، کاتب نے اپنا نام اور سنہ کتابت لکھا ہے۔

"بقلم ناچیز محمد احمد عفی عنہ...... المرقوم، ۲۷ر ذوالقعدہ ۱۳۲۲ھ یوم پنجشنبہ وقت ۷ ربجے صبح"

فی صفحہ سترہ سے بیس تک سطریں ہیں، پہلے سترہ صفحات کے حواشی پر، خلیفہ ابو محمد محی الدین کے سوالات کا جواب نقل ہوا ہے، درمیان سے دو تین کے علاوہ اکثر صفحات کے حاشیے سادہ ہیں۔

نسخہ مونگیر، مکتوبہ بدست حضرت علامہ انور شاہ کشمیری: اس فتوے یا رسالہ کا ایک عمدہ صاف نسخہ، شہرۂ آفاق جلیل القدر عالم اور محدث، علامہ انور شاہ کشمیری کے قلم سے، خانقاہ رحمانیہ مونگیر، کے ذخیرہ میں محفوظ تھا، اس ذخیرہ کا یہ نسخہ مولانا عبدالماجد صاحب (کمراؤں ضلع دربھنگہ، بہار) کی خانقاہ کی لائبریری کو عنایت کی ہوئی، کتابوں میں شامل ہے۔ مولانا منت اللہ رحمانی صاحب نے اس نسخہ کا عکس، خانقاہ مونگیر سے سنہ ۱۳۸۳ھ (۶۴-۱۹۶۳ء) میں، عمدہ آرٹ پیپر پر شائع کر دیا تھا۔ یہ طباعت صرف آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، پہلا صفحہ سرورق کا ہے، دوسرے پر کتب خانہ رحمانیہ کا فوٹو ہے، تیسرے چوتھے صفحہ پر، مولانا منت اللہ رحمانی کے قلم سے، اس نسخہ کی وجہ اشاعت اور اس کا تعارف "تقریب" کے عنوان سے درج ہے۔ تین صفحات پر حضرت شاہ صاحب کا مکتوبہ نسخہ، یا فتوی آیا ہے، آخری صفحہ سادہ ہے۔ مگر تعجب ہے کہ مولانا منت اللہ رحمانی نے اس کو، حضرت شاہ صاحب کی تالیف سمجھا ہے اور اسی حیثیت سے شائع بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میری خوش نصیبی ہے کہ حضرت (علامہ انور شاہ کشمیری) کی ایک علمی تحریر جس کا تعلق ہندوستان کے دارالحرب

ہونے سے ہے، آپ کے ایک لائق شاگرد، جناب مولانا عبدالماجد صاحب کمراؤں ضلع دربھنگہ، کے ذریعہ حاصل ہوئی اور الحمدللہ، کہ آج اس کی اشاعت کی سعادت نصیب ہورہی ہے

حضرت شاہ صاحب نے اپنی اس تحریر میں، سب سے پہلے، کسی ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کی، اصل وبنیاد بیان کی ہے"

سمجھ میں نہیں آتا، کہ مولانا منت اللہ رحمانی صاحب جیسے جید فاضل اور باخبر عالم کو، اتنا بڑا مغالطہ، کس طرح ہوا، یا تو مولانا رحمانی صاحب، حضرت مولانا گنگوہی کے اس فتوے سے واقف ہی نہیں تھے، یا اس کا مطبوعہ نسخہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، ورنہ ایسا دعویٰ نہ فرماتے، جس کا ثابت کرنا ممکن نہیں۔ بلاشبہ یہ تحریر یا فتوی، حضرت علامہ انور شاہ کے قلم سے ہے، مگر یہ حضرت علامہ کی اپنی تالیف یا افادہ نہیں ہے، بلکہ حضرت علامہ نے، ان صفحات میں حضرت مولانا گنگوہی کا وہی معروف فتوی نقل کیا ہے، جو بعد میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے ذریعہ سے، شائع ہوکر عام ہو۔ مولانا رحمانی کی اس فروگذاشت پر، مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے متوجہ اور متنبہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

"اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں، کہ یہ تحریر لکھی ہوئی حضرت الاستاد کے ہاتھ کی ہی ہے، لیکن ساتھ ہی اس میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا کہ حضرت الاستاذ اس کے صرف ناقل ہیں، مصنف نہیں، کاتب ہیں، صاحب تحریر نہیں، اس بنا پر اس تحریر میں جو کچھ درج ہے، اس کو شاہ صاحب کی رائے یا فتوی قرار دینا، قطعاً غلط ہے(۱)

نسخہ مونگیر اور نسخہ مرتبہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب میں، کوئی بڑا بنیادی فرق نہیں ہے، بلکہ کئی مرتبہ یہ خیال آتا ہے کہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو جو نسخہ ملا تھا، وہ غالباً حضرت علامہ کے مکتوبہ نسخہ، یا ایسی کسی کا اصل پر مبنی ہے، جس سے دونوں نسخے نقل کئے گئے ہیں۔ بہر حال یہ نسخہ جو مولانا منت اللہ نے شائع کیا ہے، نہ حضرت علامہ کشمیری کی تالیف ہے، نہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے مذکورہ فتوی کے علاوہ، کوئی اور یہ تحریر! یہ وہی فتویٰ ہے جو حضرت مولانا گنگوہی نے، مولانا سعید الدین کے سوال کے جواب میں، تحریر فرمایا تھا۔ مولانا اکبر آبادی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"اب آپ حضرت شاہ صاحب کی تحریر کو، حضرت گنگوہیؒ کی تحریر کے ساتھ ملا کر پڑھئے، تو معلوم ہوگا کہ اول الذکر مؤخر الذکر کی حرف بحرف نقل ہے، فرق اگر ہے تو صرف اس قدر، کہ فتوے کے ناقل، چوں کہ حضرت شاہ صاحب خود ہیں، اس لئے املا اور کتابت کے اغلاط سے، یہ تحریر بالکل پاک وصاف ہے"(۲)

نسخہ مطبوعہ دیوبند اور مطبوعہ مونگیر کے مقابلہ سے، یہ حقیقت بالکل بے غبار ہوجاتی ہے کہ دونوں کی اصل ایک ہے اور

(۱) نفثۃ المصدور ——— اور ——— "ہندوستان کی شرعی حیثیت" مولانا سعید احمد اکبر آبادی ص:۳۲ (علی گڈھ:۱۹۶۸ء)

(۲) ہندوستان کی شرعی حیثیت ص:۳۳

ان دونوں میں جو جزوی اختلاف ہے، وہ راقم سطور کے مرتبہ نسخہ کے حاشیہ میں درج دونوں کے اختلافات سے واضح ہو جائے گا۔(۱)

خلاصہ یہ ہے کہ مونگیر سے شائع رسالہ: ''ہندوستان اور دارالحرب'' کا حضرت علامہ انور شاہ کشمیری سے کتابت کے علاوہ کسی اور پہلو سے انتساب درست نہیں، یہ حضرت مولانا گنگوہی کا وہی معروف فتوی ہے، اس لئے نسخہ مونگیر کو بھی اس فتوے کے بنیادی نسخوں میں شمار کیا جانا چاہئے۔

طبع اول، دیوبند، ۱۳۵۲ھ: اس فتوی کی پہلی اشاعت وہ ہے، جو مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی دیوبندی کے ترجمہ اور حاشیہ کے ساتھ اول مفتی صاحب کے رسالہ، ماہ نامہ المفتی دیوبند میں مضمون کی صورت میں چھپی تھی، اس کے بعد، ''فیصلة الاعلام فی دار الحرب و دار الاسلام...... المعروف بہ...... کیا ہندوستان دارالحرب ہے''؟ کے نام سے، دارالتبلیغ دیوبند سے ۱۳۵۲ھ (غالباً جمادی الاولیٰ، اگست وستمبر سنہ ۱۹۳۳ء) میں، کتابی صورت میں شائع ہوئی۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اس فتوی کا اردو ترجمہ کیا، حوالوں کی مراجعت کی، چند توضیحات اور اضافے، مولانا مفتی محمد سہول بھاگلپوری (۲) صدر مفتی دارالعلوم دیوبند نے بھی کئے۔ یہ اس نسخہ کی اب تک کی واحد کتابی اشاعت ہے، اگرچہ اس رسالہ یا اشاعت سے نقل ہو کر، یہ فتوی اور جگہ بھی چھپا ہے، مگر ان متأخر اشاعتوں پر اعتماد صحیح نہیں۔

مفتی محمد شفیع صاحب کا چھاپا ہوا نسخہ سولہ صفحات کا ہے، پہلا صفحہ سرورق کا ہے، دوسرے پر، مولانا محمد شفیع کی مرتبہ تمہید ہے، صفحہ ۳ سے ۱۴ تک فارسی فتوی اور ترجمہ اور حاشیے درج کئے گئے ہیں۔ اب اس طباعت کے نسخے بھی کم یاب ہیں، تاہم ہمارے ذخیرہ میں، اس طباعت کا صاف ستھرا ایک عمدہ نسخہ موجود ہے (۳)

اس طباعت کے متعلق، مولانا محمد میاں صاحب کی اطلاعات درست نہیں: مولانا محمد میاں صاحب نے اپنی کتاب ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' میں اس فتوے (مطبوعہ دارالاشاعت دیوبند) کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، وہ غلط فہمی ہی نہیں بلکہ تہمت کے زمرہ میں آ سکتا ہے۔ مولانا نے لکھا ہے:

---

(۱) یہ اختلافات نسخ زیر نظر طباعت میں درج نہیں کئے گئے، ان کے وہ اشاعت ملاحظہ ہو، جو صرف اسی نسخہ اور اس کے متعلقات پر مع اس متن اور ترجمہ کے علیحدہ شائع ہوئی ہے۔(نور)

(۲) مولانا محمد سہول عثمانی بھاگل پوری سنہ ۱۸۷۴ء (۹۱-۱۲۹۲ھ) میں ولادت ہے ۱۴ رجب سنہ ۱۳۶۷ھ ۲۳ رمئی سنہ ۱۹۴۸ء کو وفات ہوئی، مفصل حالات کے لئے دیکھئے حیات مولانا محمد سہول عثمانی بھاگل پوری، مؤلفہ محمد قسیم الدین فیروزی (کراچی: ۱۹۷۶ء)۔

(۳) یہ نسخہ میرے والد ماجد مدظلہ کے ایک اہم سبق اور خاص دوست، مولانا محمد عاقل الٰہ آبادی (سابق آرگنائزر، جمعیۃ علمائے ہند) کا مملوکہ ہے، مولانا عاقل صاحب کے قلم سے اس کے آخری صفحات پر مفصل حاشیے لکھے ہوئے ہیں۔

"حضرت امام ربانی نے نہایت مبسوط اور مدلل فتویٰ فارسی زبان میں تحریر فرمایا، جس کی اشاعت کانگریسی وزارتوں سے پہلے ناممکن رہی، اور جیسے ہی (۱۹۳۷ء میں) کانگریس وزارت قائم ہوئی، تو بازار کے چلنے والی چیز تصور کر کے، اس کو ایسے بزرگ نے شائع فرمایا، جن کا مسلک اس فتوے کے خلاف ہے۔ پھر آخر میں شمس الہدیٰ پٹنہ کے سابق پرنسپل نے، ایک صفحہ کا بے معنی فتویٰ لگا کر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا" (۱)

افسوس کہ مولانا محمد میاں نے اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ سراسر ناانصافی اور زیادتی ہے، اس میں جو باتیں کہی گئی ہیں بلاشبہ وہ سب غلط ہیں:

الف: یہ فتویٰ کانگریس کی وزارت بننے سے چار سال پہلے، سنہ ۱۳۵۲ھ غالباً جمادی الاولیٰ (اواخر اگست/ستمبر ۱۹۳۳ء) میں شائع ہو چکا تھا، کانگریس کی یوپی میں پہلی وزارت، وسط سنہ ۱۹۳۷ء (وسط ۱۳۵۶ھ) کے بعد قائم ہوئی تھی، (۲) اس لئے مفتی صاحب کی اس خدمت واشاعت کو کانگریسی وزارتوں سے جوڑنا ناواقفیت اور بے خبری، یا شاید مسلم لیگ اور اس کی جدوجہد سے وابستہ علماء سے، کھلی نفرت اور صاف تعصب پر مبنی ہے۔

ب: مولانا مفتی محمد شفیع نے اس فتوے کو اس کے دینی ملّی مفادات کی وجہ سے نہیں، بلکہ بازار کی چلنے والی چیز سمجھ کر شائع کیا تھا۔ حالاں کہ اگر دیکھئے تو اس سولہ صفحہ کی مختصری، کتاب کی اشاعت سے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو (بشرطے کہ یہ کتاب بہت جلد اور تیزی سے فروخت ہو گئی ہو) زیادہ سے زیادہ دس بارہ روپئے کی بچت ہوئی ہوگی، جو مفتی صاحب کے لئے کوئی بات نہیں تھی، لہٰذا یہ بات بھی بے جا اور نامناسب ہے۔

ج: یہ بھی سراسر الزام ہی ہے، کہ اس فتوے کے مرتب وناشر (مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) کا عمل اس فتوے کے خلاف تھا، بلکہ جس کسی نے حضرت مولانا گنگوہی کے اس موضوع کے فتاویٰ کو توجہ سے پڑھا ہے، وہ جانتا ہے کہ حضرت گنگوہی کا مسلک ہی وہی تھا، جس پر مفتی شفیع وغیرہ کا عمل تھا، حضرت مولانا گنگوہی، اس وقت سیاسی تحریکات کے حق میں اور ان کے ہم نوا نہیں تھے۔ بعد میں حالات نے کیا رخ اختیار کیا، اس کی کیا وجوہات واسباب تھے، وہ ایک الگ بحث ہے۔

د: مولانا محمد میاں صاحب نے، مولانا مفتی محمد سہول صاب کا تعارف بھی اس طرح کرایا ہے، جس سے مفتی صاحب کے لئے غلط تاثر پیدا ہوتا ہے، اس فتوے کا حاشیہ لکھتے وقت مولانا محمد سہول دار العلوم کے اعلیٰ درجہ کے مدرس اور صدر مفتی تھے۔ نیز مولانا محمد سہول، مولانا لطف اللہ علی گڈھی، مولانا محمد حسن کانپوری اور محمد فاروق چڑیاکوٹی کے علاوہ، شیخ الہند مولانا محمود حسن کے بھی خاص شاگرد تھے، حضرت مولانا گنگوہی سے تلمذ کی بھی ایک روایت ہے، کثیر استفادہ تو بہر حال ثابت ہے۔ مولانا

(۱) علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے صفحہ: ۹۶۔ حصہ اول

(۲) بعض معلومات کے لئے دیکھئے: یاد ایام (آپ بیتی) نواب سعید احمد خاں (نواب چھتاری۔ جو اس وقت یوپی کے گورنر تھے) حصہ دوم (علی گڈھ: بلاسنہ۔ نیز اپنی کہانی (آپ بیتی) ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ سابق صدر جمہوریہ ہند۔ (دہلی: ۱۹۶۱ء)

دارالعلوم میں مدرس رہے، اس کے بعد حضرت شیخ الہند کے حسب ہدایت اور مختلف مقامات پر درس دیا۔ مولانائے شیخ الہند کی ہدایت پر، مدرسہ عالیہ کلکتہ وابستہ ہوئے، پھر شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل کے لئے انتخاب ہوا، پھر دارالعلوم دیوبند کے بلانے پر دوبارہ دیوبند آگئے تھے، لہٰذا مولانا سہول صاحب کو صدر مفتی دارالعلوم لکھنا چاہئے تھا۔

مولانا محمد سہول صاحب نے اس تحریر میں صرف یہ لکھا ہے کہ، میں نے خود حضرت مولانا گنگوہی سے سنا ہے کہ ''ہندوستان دارالامان ہے'' مولانا سہول نے ساتھ ہی اپنی رائے بھی لکھ دی ہے، کہ ہندوستان سے ہجرت کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ صراحت نہیں ملی، مگر قرائن سے واضح ہے کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق، حضرت مولانا گنگوہیؒ کی جس زبانی روایت کا، مولانا محمد سہول نے ذکر کیا ہے، وہ دراصل حضرت مولانا گنگوہی کے، اس مفصل فتوے کا حاصل اور ترجمانی ہے جو فتویٰ مجلس الانصار (دارالعلوم دیوبند) کے پہلے سالانہ جلسہ، منعقدہ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۹ھ (اپریل ۱۹۱۱ء) میں پڑھا اور سنا گیا تھا، بعد میں مجلس الانصار کی روداد میں بھی شائع کیا گیا تھا، اس وقت تک اکابر علمائے ہند کی متفقہ رائے تقریباً یہی تھی، جو اس فتوے میں درج ہے اس میں جو تبدیلی آئی وہ بعد کے حالات کا اثر تھا، اس لئے مولانا محمد سہول کی اس رائے اور حاشیہ پر ناگواری، بے محل معلوم ہوتی ہے۔

میرے خیال میں، اس اندراج کے ساتھ ہی، مولانا محمد میاں صاحب کو یہ اعتراف بھی فرمانا چاہئے تھا کہ، مولانا محمد سہول کی ہجرت نہ کرنے کے متعلق، رائے بالکل درست تھی، تحریک ہجرت سے ہندوستان کے مسلم نوجوانوں کو، جو غیر معمولی اور ناقابل تلافی نقصان ہوا اور اس بے مقصد ہجرت کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہزاروں، مسلمان نوجوان جس طرح خانماں برباد ہوئے، اس کو برصغیر کی ملی تاریخ کا ایک المیہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے مولانا محمد سہول کی اس رائے اور حاشیہ پر ناگواری بے محل ہے۔

ہندوستان کی شرعی حیثیت کے حوالہ سے زیر بحث، فتوائے دارالحرب، اس موضوع پر حضرت مولانا گنگوہی کا پہلا اور آخری فتویٰ نہیں ہے، اسی سلسلہ میں حضرت مولانا کے کم سے کم دو فتوے اور معلوم ہیں، جو فتوائے دارالحرب کے بعد لکھے گئے ہیں، یہ دونوں فتوے مفصل فتوے سے خاصے مختلف ہیں، ان میں پہلا فتویٰ جو نسبۃً مختصر ہے، اس میں حضرت مولانا نے اپنی سابقہ مفصل رائے سے، کسی قدر رجوع فرماتے ہوئے، لکھا ہے کہ:

بہ ظاہر تحقیق بندہ کو خوب نہیں ہوئی...... اور لکھا ہے کہ: اور بندہ کو بھی خوب تحقیق نہیں کہ کیا کیفیت ہند کی ہے۔

یہ مختصر فتویٰ، فتاوی رشیدیہ کی نئی پرانی تمام اشاعتوں میں شامل ہے۔ فتاویٰ رشیدیہ کی پہلی دوسری طباعت میں صراحت ہے کہ، حضرت نے یہ فتویٰ، حافظ اللہ دیہ صاحب مقیم بسی کوٹلہ، ضلع بجنور کے، منجملہ بتیس سوالات میں سے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ یہ سوالات یک جا تھے، حضرت نے اپنے معمول کے مطابق ان کے جوابات بھی، بیک وقت

تحریر فرمائے اس فتوے کی تحریر کی تاریخ، حضرت کے قلم سے ۱۶ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ (۱۷ ستمبر ۱۸۹۴ء) درج ہے، اس لئے مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کا یہ خیال درست نہیں کہ:

''قیاس کہتا ہے کہ یہ اگر واقعی حضرت گنگوہی کی تحریر ہے بھی، تو فتوائے ثانی پر یقیناً برسوں مقدم ہوگی (۱)

لہٰذا یہ کہنا تو اب درست نہیں، کہ یہ فتویٰ معروف مفصل فتوے کے بعد کا ہے۔ اس سے صرف یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت نے دارالحرب ہونے کی، اپنی رائے پر جلد ہی نظر ثانی فرمائی تھی، اس خیال یا نظر ثانی کا آغاز اسی مختصر فتوے سے ہوا تھا۔ اس فتوے کے الفاظ یہ ہیں:

سوال: ہند بقول امام یا صاحبین، کیا دارالحرب ہے، اگر نہیں، تو مولانا محمد اسماعیل صاحب دہلوی نے صراط مستقیم میں کس وجہ سے، عصر ماضیہ میں اکثر کی نسبت ایسا لکھا ہے اور فتنۂ سابقہ میں، اکثر اکابر، اعلاء کلمۃ اللہ کی طرف کیوں مائل تھے۔ (۲) اگر مستامنین قرار دیکر ارتفاع امان کو علت کہا جاوے، تو یہ بھی محل تأمل ہے۔ بینوا بالتفصیل۔

الجواب: ہند کے دارالحرب ہونے میں اختلاف علماء کا ہے۔ بہ ظاہر تحقیق حال بندہ کو خوب نہیں ہوئی، حسب اپنی تحقیق کے سب نے فرمایا ہے اور اصل مسئلہ میں کسی کو خلاف نہیں اور بندہ کو بھی خوب تحقیق نہیں، کہ کیا کیفیت ہند کی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ رشید احمد عفی عنہ گنگوہیؒ (۳)

---

(۱) ہندوستان کی شرعی حیثیت ص: ۳۵

(۲) شاہ محمد اسماعیل شہید نے صراط مستقیم میں فرمایا ہے: ''حال ہندوستان را دریں جزو زمان کہ سنہ یک ہزار و دو صد و سی و سوم است کہ اکثرش دریں ایام دارالحرب گردیدہ'' صراط مستقیم فارسی ص: ۱۰۵ (مطبع ضیائی میرٹھ: ۱۲۸۵ھ)

ہندوستان کا حال اس وقت جو سنہ ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) ہے، یہ ہے کہ اس کا اکثر حصہ دارالحرب ہو گیا ہے۔

(۳) ملاحظہ ہو: فتاویٰ رشیدیہ، مرتبہ حافظ عزیز الدین مراد آبادی۔

الف: طبع اول صفحہ ۴۱۔ حصہ دوم، مطبع افضل المطابع (مراد آباد: ۱۳۲۳ھ)

ب: طبع دوم ص: ۴۱ (مراد آباد: ۱۳۲۷ھ)

ج: طبع سوم ص: (ہندوستانی پرنٹنگ ورکس دہلی۔ برائے مطبع قاسمی دیوبند: ۱۳۳۳ھ)

د: طبع چہارم، (مبوب باہتمام مولانا مفتی کفایت اللہ شاہجہان پوری / کتاب الاثبات) ص: ۱۵۵ حصہ دوم (کتب خانہ رحیمیہ دہلی: ۱۳۴۸ھ)

مذکورہ بالا نسخے فقہی ترتیب پر مرتب نہیں، سب سے پہلے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب شاہجہاں پوری کے اہتمام اور نگرانی میں فتاویٰ رشیدیہ کی تدوین و ترتیب ہوئی تھی، اس ترتیب میں جملہ فتاویٰ الگ الگ کر کے ابواب فقہ کی ترتیب پر درج کئے گئے تھے، اس لئے اس میں درج تمام فتووں کی ترتیب بھی بدل گئی اور یہ بھی معلوم نہ رہا کہ کونسا فتویٰ کس نے اور کب دریافت کیا تھا۔ یہ مبوب مجموعہ فتاویٰ سب سے پہلے کتب خانہ رحیمیہ سنہری مسجد پھر جامع مسجد دہلی سے ۱۳۴۸ھ (۱۹۳۰ء) اور ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۳ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس ترتیب و اشاعت میں مذکورہ بالا فتویٰ دوسرے حصے کے آخر میں باب متفرقات (کتاب الاثبات) میں درج ہے...... ملاحظہ ہو: ص: ۱۵۵ حصہ اول (دہلی: ۱۳۴۸ھ)

اس مختصر فتوے کے بعد حضرت نے اپنے گذشتہ فتوے پر مفصل نظر ثانی کی بعض مجمل اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ، حضرت مولانا نے (اپنے ایک اہم معمول کے مطابق) اس فتوے کو اشتہار کی صورت میں، شائع کرکے تقسیم کرادیا تھا۔ یہ فتویٰ اس کے بعد کم سے کم دو مرتبہ اور چھپا تھا، دوسری اشاعت جو پہلی اشاعت کی طرح اشتہار کی صورت میں تھی، اس پر منجملہ اور علماء کے، (شیخ الہند) حضرت مولانا محمود حسن کے بھی تائیدی دستخط تھے۔ مولانا سید اصغر حسین دیوبندی نے سوانح شیخ الہند میں لکھا ہے کہ:

"حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ کے نام سے، ایک زمانہ میں بضرورت شرعی، جو فتاویٰ عدم جواز غدر بامعاہدین اور حرمت قتل معاہدین کے شائع ہوئے، وہ حضرت مولانا (شیخ الہند) کے تصدیق فرمودہ اور دستخط سے مزین تھے" (۱)

اس فتوی کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیجئے کہ، اس کو حضرت شیخ الہند کی رہنمائی میں قائم، دیوبند کی ممتاز دینی علمی تنظیم، مؤتمر الانصار کے، پہلے سالانہ جلسہ ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) کی روداد میں یہ فتویٰ ایک معتمد مشترکہ دستاویز کے طور پر شامل کیا گیا تھا، یہی اس کی آخری معتبر اشاعت ہے (۲)

حضرت گنگوہی کا یہ آخری فتوی، غالباً ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۰ء) سے پہلے کا ہے، اس وقت تک برطانوی حکومت اپنے ان معاہدوں اور اعلانات کی پابند تھی، کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی اور مسلمانان ہند، حکومت کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔

جب تک برطانوی حکومت نے اس کی پاسداری کی، مسلمان بھی اس کے پابند رہے، اور جب خود اصل فریق نے، اس کی علی الاعلان خلاف ورزی شروع کردی، اپنے طے کیے ہوئے تمام وعدوں کو کالعدم کرتے ہوئے، تمام اصولوں اور معاہدوں کو توڑ دیا اور خصوصاً مسلمانوں کے مقدس مقامات پر دست درازی شروع کردی، اس وقت علمائے ہند نے بھی، اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کی ضرورت سمجھی، اس وقت انگریز کے خلاف تحریر و بیان کے علاوہ، فتاوی اور عملی میدانی جدو جہد کی بھی دوبارہ ترتیب و تشکیل کی گئی۔ یعنی علماء کرام نے یہ ربانی اصول پیش نظر رکھا تھا کہ:

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (بنی اسرائیل: ۷) اگر بھلائی کی تم نے بھلا کیا اپنا، اور اگر برائی کی تو اپنے لئے (ترجمہ شیخ الہند)

مگر حضرت مولانا گنگوہی، ان معاملات سے برسوں پہلے، ۱۳۲۳ھ (اگست ۱۹۰۵ء) میں وفات پاچکے تھے، اس لئے اس کے بعد، اس موضوع پر حضرت کے قلم سے کوئی اور فتوی نہیں آیا۔ یہی فتوی اس سلسلہ میں حضرت مولانا کی آخری رائے ہے۔

(۱) حیات شیخ الہند، مولانا سید اصغر حسین دیوبندی۔ ص: ۲۲۰ (لاہور: ۱۹۷۷ء)

(۲) روداد اجلاس اول، مؤتمر الانصار مرادآباد سنہ ۱۳۲۹ھ ص: ۵۰ (مطبع قاسمی دیوبند بلا سنہ)

نیز اس فتوے کی وجہ سے، حضرت مولانا گنگوہی پر جلد رائے بدلنے کا اعتراض بھی بے محل ہے، یہ فتاویٰ کے تضاد یا عدم اطمینان و استقلال کی بات نہیں، بلکہ درحقیقت یہ اس وقت کے سیاسی حالات اور برطانوی حکومت کے قول و عمل کا تضاد تھا، جس کی وجہ سے متعلقہ مسائل اور احکام بھی متاثر بلکہ تبدیل ہو گئے۔

حضرت مولانا کے فتووں کے اس اختلاف کا تذکرہ کرتے ہوئے، مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی یہاں پیش نظر رہنا چاہئے۔ مولانا کہتے ہیں:

"جب حالات ذرا بہتر ہوئے مگر مطلع بالکل صاف نہیں ہوا تھا، تو مولانا کو اب پہلی رائے پر اصرار تو نہیں رہا، لیکن ساتھ ہی کھل کر دارالحرب ہونے کی نفی بھی نہیں کر سکے اور جیسا کہ فتویٰ رشیدیہ میں ہے کسی قطعی بات کے کہنے سے معذرت فرمادی۔ پھر جب حالات اور زیادہ بہتر ہوئے، امن و امان مکمل طور پر بحال ہو گیا اور مذہبی فرائض و معمولات بلا خوف و خطر ادا ہونے لگے، تو اب حضرت گنگوہی نے اس کو دارالامان ہی قرار دیا" (۱)

حضرت مولانا گنگوہی کی پوری زندگی، اس کی گواہ ہے کہ حضرت مولانا مسائل شرعیہ کی تحقیق و تحریر میں، صرف اور صرف حکم شریعت کو سامنے رکھتے تھے، اگر کسی مسئلہ پر کسی بھی وجہ سے رائے تبدیل ہوتی، تو اس کا بھی اظہار و اعلان فرمادیتے تھے۔

اگرچہ حضرت مولانا نے برطانوی نظام حکومت میں، اسیر مملکت ہند کے دارالحرب ہونے کا مفصل فتویٰ صادر فرمادیا تھا، مگر غالباً حالات کے نسبۃً وسیع مطالعہ اور ملک میں جاری، حکومت کے اعلانات و قوانین کی وجہ سے، جلد ہی یہ خیال ہو گیا تھا کہ اس ملک کی واقعی حیثیت اب وہ نہیں رہی جس کا اس فتوے میں اظہار ہوا ہے، اس لئے حضرت مولانا کو اپنی تازہ رائے کا اعلان واظہار کرنے میں ذرا بھی تأمل نہیں ہوا، کیوں کہ نہ وہ پہلا فتویٰ کسی دنیاوی مقصد و منافع پر مبنی تھا نہ یہ۔ حضرت مولانا کا اصول یہ تھا کہ جو مسئلہ معلوم ہے اس کی وضاحت شرعاً مجھ پر ضروری ہے، ایک فتوے کے ضمن میں اپنے اس نظریہ کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"بندہ مفتی ہے، مسئلہ حق جو اپنے نزدیک ہوتا ہے، اس کو بتانا فرض ہی جانتا ہوں" (۲)

اس فتوے کا ذکر آیا ہے، تو یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ، مجلس الانصار کے اجلاس، مرادآباد (۱۳۲۹ھ-۱۹۱۱ء) کو زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ ہندوستان کے سیاسی حالات میں یکلخت غیر متوقع تبدیلی آگئی، اس اجلاس کے وقت تک ہندوستان میں ایک متوازن اور گویا غیر جانبدارانہ نظام حکومت کارفرما تھا، جس کے تحت مذہبی معاملات میں ہر اک کے لئے کامل آزادی، تعلیم ملازمت اور ترقی کے موقعوں پر، سب کے لئے یکساں ضوابط اور کسی بھی قوم کے مذہبی معاملات میں، مداخلت نہ کرنے کے اصول بنیادی حیثیت رکھتے تھے، جس کی وجہ سے ہر اک طبقہ، اس وقت برطانوی حکومت کو ایک ناگزیر آفت سمجھ کر،

(۱) ہندوستان کی شرعی حیثیت ص: ۴۳

(۲) در جواب سوال ذکر جہر کونسی حدیث سے ثابت ہے؟ مرسلہ میاں جی عبدالرحمٰن (دھمپور ضلع بجنور یوپی) مشمولہ فتاویٰ رشیدیہ ص: ۱۳۰ حصہ دوم (طبع اول مرادآباد: ۱۳۲۳ھ)

اور اپنے مذہب اور وسائل معاش کی طرف سے اک حد تک مطمئن ہو کر سیاسی معاملات ومسائل سے تقریباً یکسو ہو گیا تھا، اور موقع بہ موقع سرکار سے اپنی وفاداری کا اظہار کرتا رہتا تھا، یہاں تک کہ برصغیر کے عام باشندوں کی ترجمان، سمجھی جانے والی تنظیم کانگریس بھی اسی راہ کی مسافر تھی، وہ بھی پوری طرح انگریز حکومت کی ہم نوا اور وفادار تھی، اور ہر موقع پر وفاداری سرکار کے اعلان میں پیش پیش رہتی تھی (۱)

اگر چہ کانگریس ۱۸۸۵ء (۱۳۰۳ھ) میں قائم ہو گئی تھی، مگر کانگریس کے کسی اجلاس میں برطانوی حکومت کے حالات پر کھلا تبصرہ، یا ہندوستانیوں کے سیاسی مفادات کے لئے آزاد آوازیں، کانگریس کے قائم ہونے کے، تقریباً بائیس سال بعد، ۱۹۰۷ء (۱۳۲۵ھ) میں پہلی مرتبہ سنی گئیں تھیں، لیکن اس وقت بھی کانگریس کے ایک طاقتور حلقہ نے، اس انداز وتبصرہ کی کھل کر مخالفت کی تھی، جس پر کانگریس دو گروپوں میں تقسیم ہو گئی تھی (۲) کانگریس کے قیام کے تیس سال کے بعد تقریباً ۱۹۱۵ء میں اس پر اتفاق رائے ہوا تھا کہ کانگریس کو ملک کے باشندوں کے لئے، آزادانہ آواز اٹھانی چاہئے۔ جب ایسے باخبر اور انہی مقاصد کے لئے قائم، تنظیم (کانگریس) کا یہ حال تھا کہ وہ لمبے عرصہ تک سیاسی حقوق کے لئے کوئی آواز بلند نہ کر سکے، تو جو لوگ سیاسی میدان میں موجود ہی نہیں تھے، ان سے اس وقت ایسے سیاسی اقدامات کی امید نہیں کرنی چاہئے۔

اور اگر چہ شروع سے کچھ مسلمان بھی، کانگریس کے ہم نوا تھے اور اس سلسلہ میں حضرت مولانا گنگوہی کا، ایک فتوی یا مکتوب بھی شائع ہو چکا تھا، مگر ہندوستان کے مسلمانوں میں ۱۸۵۷ء کی باقی ماندہ چنگاریاں، اس وقت شعلہ بن کر نمودار ہوئیں، جب ہندوستان پر قابض حاکم طبقہ نے، پوری دنیا کے مسلمانوں کی دل آزاری اور خلافت اسلامیہ ترکی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے بڑے بڑے اقدامات کئے اور ہندوستانی قائدین اور مسلمانوں کو انگریزوں کی اسلامی دشمنی میں کی گئی بڑی بڑی سازشوں کا پتہ چلا اور برطانیہ کی حکومت نے، اپنے باقاعدہ معاہدوں کی کھلی خلاف ورزی شروع کی اور خلافت عثمانیہ سے کئے گئے، تمام معاہدوں کو یک طرفہ توڑ دیئے۔

یہ بلقان کی دوسری جنگ تھی، جس کی حرارت سے مسلمانان عالم کے دل سوختہ اور مضطرب تھے، اس کی وجہ سے مسلمان رہنما بھی، اپنے تمام پرانے معاہدوں اور معاملات پر نظر ثانی کر کے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو رہے تھے، کہ اس وقت پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کا، برطانیہ سے بڑا دشمن کوئی نہیں، جس کے یہاں نہ کسی معاہدہ کا پاس ہے، نہ اپنی زبان اور قول وقرار کا خیال؛ بالکل ایسے ہی حالات تھے، جیسے آج کل ہیں کہ پورا عالم اسلام اور مسلم دنیا امریکہ کے مظالم کی چکی میں، مسلسل پس رہی ہے مگر اس

---

(۱) کانگریس کا دوسرا اجلاس دسمبر ۱۸۸۶ء میں کلکتہ میں منعقد ہوا تھا جس میں ایک تجویز یہ بھی منظور ہوئی تھی کہ: "ملکہ معظمہ قیصر ہند کو جوبلی کا مبارک باد دیا جائے اور ان کی درازی عمر اور ترقی دولت کے واسطے دعا مانگی جائے" رپورٹ، تیسری انڈین نیشنل کانگریس دسمبر ۱۸۸۷ء مرتبہ ومولفہ گنگا پرساد ورما۔ (لکھنؤ ۱۸۸۷ء)

(۲) معلومات کے لئے دیکھئے تواریخ کانگریس، ڈاکٹر پی پٹابھائی سیتارامیہ۔ ص: ۱۹۱، اردو ترجمہ (طبع اول لاہور بلا سنہ)

کی کہیں کوئی دادو فریاد نہیں ہے۔ ایسے وقت میں یہی ہوتا ہے کہ کمزور سے کمزور قومیں، بڑی سے بڑی طاقت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہیں، برزن! بول دیتی ہیں اور کہہ دیتی ہیں کہ تنگ آمد بہ جنگ آمد! ایسے ہی حالات میں یہ فیصلہ بھی کیا جاتا ہے کہ:

کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑادو

بہر حال حضرت مولانا کے ان دونوں فتوؤں کے، برصغیر ہند کے مسلمانوں اور یہاں کی ملی تاریخ پر، گہرے اثرات محسوس کئے گئے۔ حضرت مولانا گنگوہی کے شاگردوں اور منتسبین کی، ایک جماعت نے حضرت مولانا گنگوہی کی وفات کے عرصہ کے بعد، سیاسی امور ومعاملات میں، پہلے فتوے [دار الحرب] کو اپنا رہنما بنایا، دوسری جماعت نے، دوسرے کو۔ یہ اختلاف رائے جو اس وقت پہلی مرتبہ، سامنے آیا تھا، آج تک اسی طرح جاری ہے۔ اس میں کس نے کیا کھویا کیا پایا، یہ ایک لمبی اور پرپیچ بحث ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کا مفصل تذکرہ ہو زیر نظر صفحات اس کا محل نہیں (۱)

حضرت مولانا گنگوہی کے قلم سے شرکت کانگریس کی شروط اجازت:

ہندوستان کی شرعی حیثیت کے حوالہ سے، حضرت مولانا گنگوہیؒ کے اسوقت تک صرف یہی تین فتوے معلوم ہیں، جن کا تذکرہ ہوا۔ تاہم حضرت کی ایک تحریر یا فتوی اور ہے، جس میں اگرچہ ہندوستان کی شرعی حیثیت یا برطانوی نظام حکومت سے، اتفاق واختلاف کا کچھ تذکرہ نہیں، مگر ہندوستان کی سیاسی تحریکات کے تذکرہ میں، اس کا کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے، یہ تذکرہ مسلمانوں نے بھی کیا ہے اور غیر مسلموں نے بھی، جس میں کانگریس کے بڑے قائدین اور برصغیر کے ممتاز سیاسی رہنما بھی شامل ہیں، اس لئے یہاں اس کو نظر انداز کرنا صحیح نہ ہوگا۔

کانگریس، جو بعد میں ایک بڑی اور جاندار سیاسی جماعت، کے طور پر افق پر نمودار ہوئی اور اس وقت سے آج تک برصغیر کی سیاسی زندگی اور سرگرمی کے ہر اک دور، ہر پہلو پر اثر انداز رہی ہے، ایک ایسی تنظیم کے طور پر قائم کی گئی تھی، جس کا مقصد، انگریز حکومت کو، ہندوستانیوں کے نظریات وخیالات سے آگاہ کرنا اور ان کی ضرورتوں اور مطالبات سے واقف رکھنا تھا۔ یہ تنظیم اس وقت بمبئی کے انگریز کمشنر ہیوم (HUME) (۲) نے قائم کی تھی، جس کے بنیادی مقاصد اور اصول میں یہ بات بھی شامل تھی، کہ ایسے امر کی بحث سے گریز کیا جاوے، جو خلاف سرکار ہو۔

اس تنظیم نے مقبولیت حاصل کی، اعلی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے اس کا خیر مقدم کیا، مسلمان بھی اس میں شریک ہوئے، لیکن بعض مسلمانوں کو اس کی شرکت سے اختلاف بھی تھا، ان کے کچھ سوالات اور شبہات بھی تھے۔ اس وقت مولانا محمد لدھیانوی نے (جو کانگریس کے پرزور حامی اور بعد کے ایک نامور سیاسی قائد، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے دادا تھے)

---

(۱) سن ۱۸۵۷ء میں علمائے سلسلہ ولی اللہیہ امدادیہ کی قیادت میں جو جنگی معرکہ محاذ شاملی وتھانہ بھون برپا ہوا تھا، اس کی مفصل تاریخ متعلقہ تمام پہلوؤں اور تفصیلات کے ساتھ راقم سطور لکھ رہا ہے۔ ایک اور کتاب سنہ ۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک برصغیر کی مسلم سیاست پر بھی لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو ان شاء اللہ تعالی ایک ایسی کتاب جس میں تمام مباحث وعنوانات پر کھل کر گفتگو ہو اور جو کسی جمعیۃ وجماعت کی، کسی ایک تنظیم وگروہ کی، کانگریس اور مسلم لیگ کی تاریخ نہ ہو، کسی ایک کا قصیدہ اور کسی ایک کا مرثیہ نہ ہو بلکہ ہندی ملت اسلامیہ کے احوال واغلاط و مصائب ومعاملات کی معتبر و استدلالی تصویر ہو، جس میں ہر ایک کا بے لاگ منصفانہ تجزیہ متوقع ہے۔ انشاء اللہ تعالی (نور)

(۲) ALLAN QCTAYIAN HUME

کانگریس میں شرکت کے متعلق، ہندوستان کے چند بڑے علماء کی رائے دریافت کی، جس میں حضرت مولانا گنگوہی بھی شامل تھے۔ اس کے سوال نامہ میں (جو محمد علی بھیم کے نام سے بھیجا گیا تھا) دو سوال تھے، کانگریس میں شرکت اور سرسید احمد کی تنظیم سے، وابستگی کا شرعی حکم! حضرت مولانا گنگوہی نے دونوں کا حسب معمول، ساتھ ہی جواب لکھا۔ کانگریس میں شرکت کے متعلق سوال اور اس کا جواب یہ ہے:

"**سوال:** ایک جماعت قومی مسمی بہ نیشنل کانگریس، جو ہندو اور مسلمان وغیرہ سکنائے ہند کے، واسطے رفع تکالیف وجلب منافع دنیاوی چند سال سے قائم ہوئی ہے، اور اس کا اصل اصول یہ ہے کہ بحث انہی امور میں ہو، جو کل جماعت ہائے ہند پر مؤثر ہوئی، اور ایسے امر کی بحث سے گریز کیا جاوے، جو کسی ملت یا مذہب کو مضر ہو، یا خلاف سرکار ہو...... تو ایسی جماعت میں شریک ہونا، درست ہے، یا نہیں؟

جواب: اگر ہندو مسلمان باہم شرکت بیع وشرا وتجارت میں کر لیویں، اس طرح میں کہ کوئی نقصان دین میں، یا خلاف شرع معاملہ کرنا اور سود اور بیع فاسد کا قصہ پیش نہ آوے، جائز ہے اور مباح ہے۔"

اس کے بعد سرسید احمد کے متعلق، چند سطور تحریر ہیں [سرسید احمد اور ان کی تحریک کے متعلق، سوال وجواب دونوں، اپنے موقع پر درج ہو چکے ہیں، اس لئے یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں] پھر لکھا ہے:

"ہنود سے شرکت معاملہ کر لینا، اور اگر ہنود کی شرکت سے اور معاملہ سے بھی، کوئی خلاف شرع امر لازم آتا ہو، یا مسلمانوں کی ذلت یا اہانت یا ترقی ہنود ہوتی ہو، وہ کام بھی حرام ہے، جیسا کہ اوپر لکھا گیا، اسی طرح پر ہے اور بس۔

بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ"(۱)

فقط۔

بہر حال یہ بھی اس سلسلہ کا ایک ضمنی فتوی یا تحریر ہے، جس سے ہندوستان کے مذاہب اور قوموں کے افراد میں، مشترکہ مفادات کے معاملات میں، حضرت مولانا گنگوہی کی رائے ایک درجہ میں، سامنے آجاتی ہے۔ یہی اس فتوے یا تحریر کے یہاں پیش کرنے کا مقصد ہے۔

نسخہ کی تدوین میں راقم سطور کی خدمت: جیسا کہ ذکر ہوا، حضرت مولانا گنگوہیؒ کے، فتوائے دار الحرب کے، اس وقت تک صرف تین نسخے معلوم ہیں۔ جس میں دو جو نسبۃً متاخر ہیں، شائع ہو چکے ہیں، جو نسخہ قدیم ترین معلوم ہے، وہ اب تک شائع نہیں ہوا تھا، آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

---

(۱) نصرت الابرار۔ مرتبہ مولانا محمد لدھیانوی..........ص: (لاہور: ۱۳۰۶ھ)
فتاویٰ قادریہ۔ مرتبہ مولانا محمد لدھیانوی..........ص: ۴۸۔۴۷ (لاہور: ۱۳۰۶ھ)
نصرت الابرار اور فتاویٰ قادریہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر حضرت گنگوہی کا ایک مفصل فتویٰ اور بھی تھا، جو مولانا لدھیانوی کے گھرانہ میں موجود تھا، مگر وہ فتویٰ نہ کہیں نقل ہوا اور نہ اب تک اس کا سراغ ملا۔

(۸۶۵)

ہندوستان دارالحرب ہے، یا دارالاسلام؟

سوال ومکتوب مولانا سعید الدین صاحب رام پوری

بنام محدث عصر، فقیہ جلیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

اے بیش ازاں کہ در قلم آید ثنائے تو ☆ واجب براہل مشرق ومغرب دعائے تو

اے در بقائے ذاتِ تو، نفع جہانیاں ☆ باقی بباد ہرکہ بخواہد بقائے تو

السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہٗ! الحمد للہ تا حال بعافیت ہستم وعافیت سامی، از دل وجاں خواہاں می باشم۔

بعض اعلام، فتوی بہ نبودن ہندوستان دارالحرب، بدلیل مسائل وروایات فقہیہ مرقومۃ الذیل، دادہ اند۔ چوں ایں روایات بنظر احقر گذشتند واحقر دراں ایام، کہ برائے تحصیل شرف قدم بوسی بخدمت حاضر شدہ بود، از زبان مبارک سامی شنیدہ بودم، کہ ایں بلاد مطابق رائے بندہ دارالحرب ہستند۔ آں وقت بمشاہدہ ضعفِ سامی، جرأت استفسار و دریافت وجہِ حکم وروایت فقہیہ نکردم۔

لہٰذا! حالا عرض میدارم، کہ اگر باقدرے تفصیل روایات فقہیہ، کہ ازاں بودن ہندوستان دارالحرب مستنبط میشود، تحریر فرمایند، واز طریق استنباط نیز اطلاع بخشند، از اخلاق نبویہ سامی بعید نخواہد بود۔ ایں روایات اینست۔ خزانۃ المفتین میں ہے:

دار الإسلام لا تصير دار الحرب إلا بإجراء أحكام الشرك فيها، وأن يكون متصلاً بدار الحرب، لا يكون بينها وبين دار الحرب مصرٌ آخر للمسلمين، وأن لا يبقى فيها مسلم وذمي آمناً بالأمان الأوّل، فما لم توجد هذه الشرائط، لا تصير دار الحرب.

ومعنى قولنا: أن لا يبقى فيها مسلم أو ذمي آمناً بالأمان الأول، أن لا يبقى فيها مسلم أو ذمي آمنا على نفسه إلا بأمان المشركين.

وقالا اذا اجروا فيها أحكام الشرك، فانها تصير دار الحرب، سواء كانت متصلة بدار الحرب اولم تكن، بقي فيها مسلم اوذمي آمناً بالأمان الاول اولم يبق.

ودار الحرب تصير دار الاسلام باجراء احكام الاسلام فيها، وإن زال غلبة اهل الاسلام. كذافي شرح السير.... لأبي اليسر.

أن دار الاسلام لاتصير دار الحرب، مالم يبطل جميع ماصارت به دار الاسلام، لأن الحكم اذاثبت بعلة، فما بقي من العلة شئ يبقى ببقائه.

وفي المنثور: دار الاسلام باجراء احكام الاسلام، فما بقي علقة من علائق الاسلام، يترجح جانب الاسلام. وفي البزازية: قال السيد الامام: والبلاد التي في ايدى الكفرة اليوم، لاشك انها بلاد الاسلام، بعد ان لم يظهر فيها احكام الكفرة بل القضاة مسلمون.

وأمّا البلاد الّتي عليها والٍ من جهتهم، فيجوز به إقامة الجمعة والأعياد، وأخذ الخراج، و تقليد القضاة، وتزويج الأيامى. وأمّا البلاد الّتي عليها ولاة كفار، فيجوز فيها أيضاً إقامة الجمعة والأعياد، والقاضي قاضٍ بتراضي المسلمين.

وقد تقرّر أن بقاء الشيءِ من العلة يبقى الحكم، وقد حكمنا بأنّ هذه الدّيار قبل استيلاء التتار كانت من ديار الإسلام، وبعد استيلائهم إعلان الجمع والجماعات، والحكم بمقتضى الشرع، والفتوىٰ والتدريس شائع بلانكير من ملوكهم، فالحكم بأنها من دار الحرب لاجهة له، اى درايةً وروايةً.

وإعلان بيع الخمور وأخذ الضرائب والمكوس، والحكم من رسم التتار (هو) كإعلان بنى قريضة بطلب الطاغوت، ومع ذلک كانت بلدة إسلام بلاريب.

وذكر أنه انما يصير دار الحرب بإجراء أحكام الكفر، وأن لايحكم فيها بحكم من الإسلام، وأن يتصل بدار الكفر وأن لايبقى فيهامسلم اوذمى امنا بالأمان الأول، فإذا وجدت الشرائط كلها صارت دار الحرب. وعند تعارض الدلائل والشرائط يبقى ماكان، اويترجح جانب الإسلام احتياطاً.

وفي شرح الزيادات للعتابي: دار الاسلام إنّما يصير دار الحرب بثلاث شرائط، أحدها: إجراء أحكام الكفار على سبيل الاشتهار.

والثاني: أن تكون متاخمة أى متصلة بدار الحرب، لايتخلّل بينهما بلدة من بلاد الإسلام.

والثالث: أن لايبقى فيها مسلم أو ذمى آمنا بالأمان الأول، فشرط هذه الشرائط ليكون علما تاما على تمام القهر والإستيلاء، اذدار الاسلام يحتاط لإرتباطه لها، وعندهما يصير دار الاسلام دار الحرب، باجراء أحكام الكفر فيها.

ودر طحطاوی، حاشیہ درمختار اینکہ:

قوله باجراء احكام الشرك أى على الاشتهار، وأن لايحكم فيها بحكم اهل الإسلام.

(وفى) الهنديه وظاهره إن أجريت أحكام المسلمين وأحكام اهل الشرك لايكون دارحرب. انتهى.

پس ایں بلاد نہ بمذہب امام صاحب و نہ بمذہب صاحبین رحمہم اللہ، دار الحرب تو انند شد، چہ موقوف و معطل شدن، احکام اسلام بالکلیہ شرط متفق علیہ معلوم میشود، وفقدان ایں شرط ظاہر! چہ بسیارے از احکام اسلام، تاہنوز باقی و جاری اند۔

واگر ایں بلاد مطابق رائے حضور دار الحرب باشند، پس دریں بلاد حکم گرفتن سود و رہن از کفار چہ باشد، ونیز از منشأ وماخذ ایں روایت کہ از کتاب وسنت باشد، ایمائے زیب رقم فرمایند۔

در صیرت دار الحرب دار الاسلام، اگر جریان بعض احکام اسلام کافی تواند بود، پس ظاہراً تمامی روے زمین دریں زمان دار الاسلام خواہد بود۔ والسلام خیر ختام۔ فقط

۱۷رشعبان ۱۳۱۰ھ [۷/ مارچ ۱۸۹۳ء]

سعد آباد ضلع متھرا

....

جواب استفتاء مولانا سعید الدین رام پوری

از حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفا عنہ

عنایت فرمائے بندہ، مولوی سعید الدین صاحب، دام اشفاقہم

بعد سلام مسنون الاسلام، مطالعہ فرمایند۔ خطِ ایشاں بماہ رمضان درباب تحقیق مسئلہ دار الحرب رسید، از آنجا کہ طبع خود مضمحل از مدت شدہ، ودر رمضان زیادت براں شد، از تحریر جواب قاصر ماندم، اکنوں آنچہ می توانم، می نگارم۔

باید شنید کہ مدار بودن، حکم بلدے وملکے بدار الاسلام وبدار الحرب، بر غلبہ مسلماناں وغلبہٗ کفار است وبس!

لہذا ہر موضع کہ مقہور حکم مسلمین است، آں را بلاد اسلام گفتہ خواہد شد، وہر محلے کہ مغلوب حکم کفار است، دار الحرب نامیدہ خواہد شد۔ قال فی جامع الرموز:

دار الاسلام مایجری فیہ حکم امام المسلمین، وکانوا فیہ آمنین. ودار الحرب ماخافوا فیہ من الکافرین، انتھیٰ۔

وقال فی رد المحتار:

سئل قاری الھدایۃ عن البحر الملح، أمن دار الحرب أو الاسلام؟ أجاب انہ لیس من احد القبیلتین، لأنہ لا قھر لأحدٍ علیہ انتھیٰ۔(۱)

غرض از نقل ایں عبارت آنست، کہ مدار بودن دار کفر واسلام، بر غلبہٗ کفر واسلام است وبس! اگرچہ در بحر ملح راجح قول بدار حرب بودن باشد بوجہے دیگر، وہر مقامیکہ مقہور ہر دو فریق باشد۔ آں را بحکم الاسلام **یعلو ولایعلی** ہم دار الاسلام خواہند گفت، مگر بہ ہمیں شرطکہ غلبہٗ وقہر، بعض وجوہ اہل اسلام درآنجا باشد، نہ آں کہ نفس مقام مسلمین درآنجا بود، یا اظہار بعض شعائر اسلام باذن کفار، درآنجا بودہ باشد، کہ نفس کون اہل اسلام در دارے، واظہار شعائر اسلام باذنِ کفار در بلدے، قابل اعتبار نیست۔ وعلی ہذا بودن کفار در دار الاسلام، واظہار شعائر کفر باذن حکام اسلام، یا بغفلت ایشاں، درآنجا دار الاسلام بودن را ضررے نمی کند۔ چہ در ہر دو شق غلبہ یافتہ نمی شود، وحکم غلبہ را است، نہ نفس وجود وظہور را۔

(۱) شامی ص:۲۳۳ رج:۳:....... باب استیلاء الکفار (مطبع اکمل المطابع دہلی: ۱۲۸۸ھ) ب: مطابق نسخۂ ع ک

ازینست کہ اہل ذمہ در دار الاسلام، قیام باذن اسلام می کنند، وشعار خود را ظاہر می نمایند، مگر دار اسلامیت بحال خودی ماند، و مسلمین در دار کفر بامن می روند، وشعائر خود را آنجا ظاہر می کنند۔ وایں ہمہ دار کفریت را رفع نمی کند۔

نہ بینی کہ فخر عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام، بجمع کثیر در عمرۃ القضاء بمکہ شریف بردند، وجماعت نماز وغیرہ شعار اسلام وغیرہ ہمہ باعلان بجا آوردند، وایں قدر جمع داشتن کہ کفار را مقہور فرمایند، چنانچہ بہ ہمیں قدر لشکر در حدیبیہ، عزم تاراج کردن، مکہ می فرمودند۔ مگر چوں ایں ہمہ اظہار، باذن کفار بود، دراں سہ ایام مکہ دار الاسلام نگشت، بلکہ دار الحرب ماند۔ چراکہ ایں قیام واظہار اسلام باذن بود، نہ بغلبہ۔

الحاصل ایں اصل کلی قاعدہ کلیہ ہست، کہ دار الحرب مقہور کفار است ودار الاسلام مقہور اہل اسلام۔ اگر چہ در یک دار فریق دیگر ہم موجود باشند، بلاغلبہ وقہر، وآنجا کہ قہر ہر دو فریق باشد وہم دار الاسلام خواہد بود۔ [ص ۲] ایں اصل را خوب ذہن نشین باید کرد، کہ جملہ مسائل از ہمیں اصل می برآیند، وہمہ جزئیات ایں باب، بر ہمیں اصل دائر ہستند۔

بعد ازیں امرے دیگر باید شنید، کہ ہر موضع کہ دار کفر باشد واہل اسلام براں غلبہ کردند، وحکم اسلام دراں جاری کردند، آں را جملہ علماء می فرمایند، کہ دار الاسلام گشت۔ چراکہ غلبہ وقہر مسلمانان یافتہ شد، اگر چہ بعض وجوہ غلبہ کفار ہم در آنجا باقی باشد، مگر تاہم بحکم: الاسلام یعلو ولا یعلی باتفاق دار اسلام شد کما وضح سابقاً۔

مگر باز واضح کردہ می شود، کہ اگر ایں دخول واظہار اسلام بغلبہ شدہ باشد، ہیچ تغیر در دار حربیت نخواہد شد، ورنہ جرمن وروس وفرانس جملہ ممالک نصاری، وچین وغیرہ ممالک کفار، دار الاسلام می شوند۔ ونشانے از دار حرب در دنیا پدید نخواہد شد، زیراکہ در جملہ ممالک کفار، اہل اسلام باذن کفار احکام اسلام جاری می نمایند وھذا ظاھر البطلان۔

بہر حال اجرائے ایں احکام بغلبہ وقہر معتبر است، وبس۔ وہر مقامے کہ دار اسلام بود وکفار براں غلبہ کردند، اگر غلبہ اسلام بالکل رفع شد، آں را حکم دار الحرب شد، واگر غلبہ کفار شد وبہ بعضے وجوہ غلبہ اہل اسلام ہم باقی ماندہ باشد، آں را دار اسلام خواہند داشت، نہ دار الحرب، دریں مسئلہ اتفاق است۔

اما اینکہ غلبہ اہل اسلام بالکلیہ رفع شدن، را چہ حد است، دراں خلاف واقع شد در میان ائمہ ما علیہم الرحمۃ۔

صاحبین می فرمایند، کہ اگر ہر دو فریق احکام خود جاری بالاعلان کردہ باشند، غلبہ اسلام ہم باقیست، ورنہ در صورت اعلان احکام کفار، وعدم قدرت اہل اسلام براجرائے احکام خود، بغلبہ خود الا باذن الکفار غلبہ اسلام ہیچ قدر باقی نمی ماند۔ وھو القیاس۔

چراکہ ہرگاہ کفار چناں مسلط شدند، کہ احکام کفر علی الاعلان والغلبہ جاری کردند، واہل اسلام آں قدر عاجز ومغلوب گشتند کہ احکام خود جاری کردن، نمی توانند، ودر حکم کفر کہ شین وعار اسلام است، قدرت ندارند، پس کدام درجہ غلبہ اسلام باقی ماند، کہ آں را دار اسلام گفتہ شود، بلکہ تسلط وغلبہ کفار را بکمال پیدا شد، ودار حرب گشت بالفعل۔ وبعد ازاں ہر چہ خواہد شد، خواہد شد، مگر الحال در دار حرب شدن، دقیقہ نماندہ، ومثل دار حرب قدیم متسلط کفار شد کما ھو الظاھر۔

وامام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، بنظر خفی استحسان فرمودہ، ودار اسلام را بحکم دار کفر دادن احتیاط کردہ، کہ تا چیزے از آثار غلبۂ اسلام یافتہ شود، ویا در استیلاء کفار وہنے یافتہ شود، کہ [ص ۳] دفع آں بر مسلمانان سخت دشوار نیاید، حکم بدار کفر نباید کرد۔

پس دو شرط دیگر زائد فرمود: یکے آں کہ آں دیہ وبلد مستولی علیہ کفار، متصل بدار کفر گردد، چنانچہ درمیان ایں قریہ مستولی ودار حرب، موضع از دار اسلام حائل نماند، کہ بایں اتصال انقطاع، از دار الاسلام بآں پیدا می شود کہ باحراز کفار درآید، وغلبہ وقہر کفار بقوت شد، واستخلاص آں از دست کفرہ دشوار گردید، ومقہوریت مسلمین سکان آنجا بکمال رسید، وایں بمشابہ آنست کہ کفار بر مال اہل اسلام استیلاء یابند، اگر باحراز دار شان رسید بملک ایشان درآید، واگر احراز ایشان بدار خود نشدہ، انقطاع ملک مالک مسلم نمی شود۔ کماھو مقرر فی سائر الکتب.

قال فی الھدایة: وإذا غلبوا علی أموالنا وأحرزوھا بدارھم ملکوھا..الخ (۱)

وقال فیہ: غیر أنّ الاستیلاء لا یتحقق إلا بالإحراز بالدار، لأنه عبارة عن الاقتدار علی المحل حالا ومآلا....الخ

پس ہم چنیں اگر ارض وعقار بلدے مثلا مستولی کفار شد، اگر استیلاء تام گشت کہ محرز بہ بلد کفر گشت، وآں احراز باتصال اوست بدار کفر، وانقطاع او از دار الاسلام، پس مقہور ایدی کفرہ گشت، ورنہ ہنوز استیلاء اہل اسلام باقیست، اگرچہ ضعیف باشد، پس بحکم: الاسلام یعلو ولا یعلی دار اسلام باید کہ بماند۔ پس حاصل ایں شرط ہم ہمون غالبیت کفار ومغلوبیت اہل اسلام است، کہ اصل کلی اولا بیان شد۔

شرط دوم آنکہ، امانے کہ حاکم اسلام، بسبب غلبہ حکومت خود، مسلمانان را بسبب اسلام، وکفار رعایا را، بوجہ عقد ذمہ دادہ بود، مرتفع گردد، کہ بآں امان کسے بر نفس ومال خود مامون نماند۔ یعنی چنانکہ بسبب امن دادن حاکم اسلام، ہمیشہ مامون شدہ بودند، کہ کسے را بسبب خوف حاکم، امن دہندہ محل نبود، کہ تعرض بجان ومال مسلم وذمی نمایند، وایں نبود مگر بسبب قوت وشوکت وغلبۂ حاکم مسلم، پس ایں امان باقی نماند، کہ کسے بعجہ ایں امان بے خدشہ از تعرض جان ومال خود نبود، بلکہ ایں امان بیکار محض گردد۔

وامانے کہ مشرکین مستولی دادند، آں موجب امن گردد، پس ظاہر است کہ تا بسبب امن حاکم مسلم، خوف موذی را خواہد بود، غلبۂ وشوکت امن مسلم بنوعے باقی ماندہ باشد، وہرگاہ آں چیزے نماند، بلکہ این مشرک متسلط محل نظر [ص ۴] گردید، امان اول رفع شد۔ پس نزد امام علیہ الرحمۃ ہرگاہ کہ بعد اجرائے احکام کفر علی الاشتہار، ایں دو شرط ہم یافتہ شد، غلبہ کفر من کل الوجوہ ثابت شد، وغلبۂ اسلام من کل الوجوہ مرتفع گردید اکنوں ہیچ از حریت ناچار حکم کردہ خواہد شد۔

(ب) مطابق (ن، ک)

(۱) ہدایہ ص: ۵۸۱ ج: ۲، باب استیلاء الکفار (مکتبہ تھانوی دیوبند ۱۴۱۶ھ)

اہل دانش رااز یں ہم معلوم میشود، کہ مدار ایں قول ہم برقہر وغلبہ است وبس، کہ اول دراصل کلی واضح کردہ شد۔
بعداز یں تقریر، روایات فقہاء را باید شنید کہ بنقل بعض آنہا سند تقریر ایں بندہ، حاصل خواہد شد، وبذکر بعض حال کل روایات، ایں باب دریافت خواہد شد، قال فی العالمگیریة:

قال محمد فی الزیادات: انماتصیر دار الاسلام دار الحرب عند ابی حنیفة بشرائط ثلاث.

احدها: اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتهار، وان لایحکم فیها بحکم الاسلام.

الثانی: ان تکون متصلة بدار الحرب، لایتخلل بینهما بلدة، من بلاد الاسلام.

الثالث: ان لایبقی مومن ولاذمی آمنا بالامان الاول، بامانه الذی کان ثابتا قبل استیلاء الکفار، للمسلم باسلامه، وللذمی بعقد الذمة.

وصورة المسئلة علی ثلاثة اوجه: اما ان یغلب اهل الحرب علی دار من دورنا، أو ارتد اهل مصر، وغلبوا واجروا احکام الکفر، اونقض اهل الذمة العهد، وتغلبوا علی دارهم، ففی کل من هذه الصور. لاتصیر دار الحرب الابثلاث شرائط. وقال ابویوسف ومحمد رحمهما الله تعالی: بشرط واحد لاغیر، وهو اظهار احکام الکفر وهو القیاس انتهی.(۱)

قال فی جامع الرموز: واما صیرورتها دار الحرب، فعنده بشروط، احدها: اجراء احکام الکفر اشتهاراً، بان یحکم الحاکم ولایرجعون الی قضاة المسلمین کما فی البحر.

والثانی: الاتصال بدار الحرب، بحیث لایکون بینهما بلدة من بلاد الاسلام، مایلحقهم العدو منها......الخ

از یں روایت جامع الرموز دوامر واضح شد:

یکے آنکہ: مراد از اجراء حکم اہل اسلام، اظہار حکم اسلام است، علی سبیل الغلبہ، نہ مطلق ادائے جماعت وجمعہ مثلاً، چراکہ می گوید بحکم بحکمهم ولایرجعون الی قضاة المسلمین یعنی قضاۃ مسلمین راہیچ شوکت ووقعت نماند، کہ بایشاں رجوع شود، وہم چناں از حکم مسلمین در دار الحرب، حکم بغلبہ کردن مراد است۔ کماهو الظاهر. بہر حال حکم اسلام وحکم کفر، ہر دو علی سبیل القوۃ والغلبہ مراد است، نہ محض ادا باظہار۔

دوم: ایں کہ غرض از شرط اتصال وانقطاع، ہموں قوت است، کہ در صورت اتصال بدار الحرب، مدد بقریہ مغلوبہ نمی رسد۔ بخلاف صورت انقطاع از دار الحرب کہ لحوق مدد می تواند، پس ہنوز قوت اسلام باقی است۔

(۱) عالمگیری ص: ۲۳۲، ج: ۲، مطلب فیما تصیر دار الاسلام دار الحرب [مکتبہ نورانی، پشاور، پاکستان سے بلاسنہ] نیز شامی نسخہ ہندیہ ص: ۲۵۳، ج: ۳، [اکمل المطابع، دہلی: ۱۲۸۸ھ]

وفی خزانة المفتین: [ص] دار الاسلام لاتصیر دار الحرب، إلا باجراء احکام الشرک فیھا، وان یکون متصلا بدار الحرب، لایکون بینھا وبین دار الحرب مصر آخر للمسلمین، وان لایبقیٰ فیھا مسلم أوذمی آمنا بالأمان الاول. فمالم توجد ھذہ الشرائط، لاتصیر دار الحرب.

ومعنی قولنا: ان لایبقی فیھا مسلم أو ذمی آمنا بالأمان الاول، ان لایبقی فیھا مسلم اوذمی امنا علی نفسہ، الاّ بامان المشرکین ....الخ

وفی البزازیة ،قال السید الامام: والبلاد التی فی ایدی الکفرة الیوم، لاشک انھا بلاد الاسلام بعد، لانہ لم یظھر فیھا احکام الکفرة بل القضاة مسلمون ،انتھیٰ.

پس باید دید، کہ دلیل بودن آں دیار بلاد اسلام می آرد، بقولہ: بل القضاة مسلمون کہ حکم حکام اسلام بطور اول باقیست ،ونمی گوید لان الناس یصلون ویجمعون ، چراکہ مراد اجراء احکام بطور شوکت وغلبہ است، نہ اداے مراسم دین خود، برضاء حاکم غالب۔

درر مختار (۱) گوید۔

فی معراج الدرایة عن المبسوط: وبلاد الاسلام التی فی ایدی الکفرة، بلاد الاسلام لابلاد الحرب، لانھم لم یظھروا فیھا حکم الکفر والقضاة مسلمون، والملوک الذین یطیعونھم ففساق عن ضرورة مسلمون ولو کانت عن غیر ضرورة منھم أوبدونھا. وکل مصر فیہ والٍ من جھتھم، تجوز فیہ اقامة الجمعة والاعیاد واخذ الخراج وتقلید القضاة وتزویج الایامی لاستیلاء المسلم علیہ، وأما بلاد علیھا ولاة کفار فیجوز للمسلمین اقامة الجمعة والأعیاد ویصیر القاضی قاضیاً بتراضی المسلمین فیجب علیھم أن یلتمسوا والیاً مسلماً.....انتھیٰ.

وفیہ ایضا: قلت، وبھذا ظھران مافی الشام من جبل تیم اللّٰہ وبعض البلاد التابعة لہ کلھا بلاد الاسلام، لانھا وان کانت لھا حکام دَرُوز اونصاریٰ ولھم قضاة علی دینھم، وبعضھم یعلنو ن بشتم الاسلام ، لکنھم تحت حکم ولاة امورنا، وبلاد اسلام محیطة ببلادھم من کل جانب، واذا اراد ولی الامر تنفیذ احکامنا فیھم، نفذھا. انتھیٰ.

(۱) شامی نسخہ ہندیہ ص:۳۰۸، ج ۳ فی کتاب القضاء مع تقدم وتاخر (مطبع مرتضوی) نیز شامی ج:۵ ص:۳۶۸-۳۶۹ [دار الفکر بیروت: ۱۳۸۶ھ]

ازیں ہر دو روایت واضح شد کہ، برائے بقاء دار اسلامیت، بعد غلبۂ کفار، بقاء قوت وشوکت حکام مسلمین وانفاذ امور بقوت وغلبہ مرادمی شود، وہم چناں در دار حرب، اجراء حکم اسلام، اگر بقوت باشد، رافع دار حربیت می شود، نہ ادائے محض شعائر اسلام، باذن ورضاء حاکم، مخالف دین۔

الحاصل، غرض ازیں شروط ثلاثہ، نزد امام صاحب واز شرط واحد کہ اجراء حکم اسلام است، نزد صاحبیہ ہموں وجود غلبہ وقوت اہل اسلام است، اگرچہ ببعض وجوہ باشد، وہیچ اہل فقہ [ص:۸] نمی گوید کہ در ملک کفار، اگر کسے باذن ایشاں صراحۃ یا دلالۃ، اظہار شعائر اسلام کند، آں ملک دار الاسلام می شود، حاشا وکلا کہ ایں دور از تفقہ است۔

چوں ایں مسئلہ منقح شد، اکنوں حال ہند را غور فرمایند کہ اجرائے احکام کفار نصاری، دریں جا بچہ قوت وغلبہ است کہ اگر ادنی کلکٹر ہم حکم دہد، کہ در مساجد نماز جماعت ادا مکنند، ہیچ کس از امیر وغریب قدرت ندارد، کہ ادائے آں نماید۔ وایں ادائے جمعہ وعیدین وحکم بقواعد فقہ کہ می شود، محض بوجہ قانون ایشانست، کہ در رعایا حکم جاری کردہ اند، کہ ہر کس حسب دین خود عمل نماید، سرکار را مزاحمت بوے نیست۔ وامن سلاطین اسلام کہ بود، ازاں نامے ونشانے نماندہ، کدام عاقل قائل خواہد شد، کہ امنے کہ شاہ عالم دادہ بود، اکنوں ہموں امن، ماموں نشستہ ایم، بلکہ امن جدید از کفار شدہ، وبہ ہموں امن نصاری جملہ رعایا، قیام ہندمی کنند۔

واما اتصال، پس آں در ممالک واقالیم شرط نیست بلکہ در قریہ وبلد ایں شرط کردہ اند، کہ مدد رسیدن ازاں بسہولت مراد است۔

وکسے می تواں گفت کہ اگر مدد کابل یا شاہ روم آید، کفار را از ہند خارج کند، حاشا وکلا! بلکہ اخراج ایشاں بسیار اصعب است ومستقل جہاد وجنگ باسامان کثیر می خواہد۔

بہر حال تسلط کفار بر ہند بداں درجہ ہست، کہ در ہیچ وقت کفار را بر دار حرب زیادہ ازیں نہ بود۔ وادامر اسم اسلام از مسلماناں محض باجازت ایشانست، واز مسلماناں عاجز ترین کسے از رعایا نیست، کہ ہنود را ہم قدرے رسوخ است مگر مسلماناں را چیزے وقعت نیست۔ البتہ در ٹونک ورامپور وبھوپال کہ حکام آنجا، باوجود مغلوب بودن کفار، احکام خود جاری دارند، دار اسلام تواں گفت، چنانچہ از روایات ردالمحتار وغیرہ مستفادمی شود، فقط

اکنوں بعد سلام مسنون آنکہ، اگر بایں تحریر طمانیت شما حاصل شود، فہو المراد، ورنہ بندہ را معذور دارند، مگر چونکہ از تحریر طویل عاجزم، ایں مسودہ را روانہ می کنم، امید کہ بعد نقلش روانہ ایں صوب فرمایند، کہ بعض مردم ایں جا ہم قصد نقلش می دارند۔

فقط والسلام

۷رشوال (۱۳۱۰ھ/۲۴راپریل ۱۸۹۳ء)

آج ۱۶رذی قعدہ ۱۴۲۶ھ بروز پنجشنبہ، تینوں نسخوں کے مقابلہ اور اختلاف نسخ کی تحریر وترتیب مکمل ہوئی۔

فلحمدللہ علی ذالک

نور الحسن راشد کاندھلوی

ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟

ترجمہ مکتوب واستفتاء

مولانا سعیدالدین رام پوری (رام پور ضلع سہارنپور)

بنام محدث عصر، فقیہ جلیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

اے اس سے بڑھ کر کہ قلم پر تیری تعریف آسکے ☆ اہل مشرق ومغرب پر تیرے لئے دعا واجب ہے

اے وہ کہ جس کے باقی رہنے میں پوری دنیا کا فائدہ ہے ☆ ہر وہ شخص باقی رہے جو تیری بقا کا متمنی ہے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ، ابھی تک خیریت سے ہوں، اور جناب عالی کی خیروعافیت کا، دل وجان سے طلب گار رہتا ہوں۔

بعض بڑے علماء نے مسائل اور روایات فقہیہ کی مدد سے، جو نیچے نقل کررہا ہوں، ہندوستان کے دارالحرب نہ ہونے کا فتوی دیا ہے۔ چوں کہ یہ روایتیں احقر کی نظر سے گزریں ہیں اور ان دنوں، جب یہ احقر قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنے کے لئے، خدمت اقدس میں حاضر ہوا تھا، میں نے زبان مبارک سے سنا تھا، کہ یہ بلاد [شہر اور علاقے]. ندہ کی رائے کے مطابق، دارالحرب ہیں۔ اس وقت جناب عالی کے ضعف کو دیکھتے ہوئے، سوال کرنے کی ہمت نہ کی، اور اس رائے کی وجہ اور اس سے ملحق فقہی روایات معلوم نہیں کیں۔

اس لئے اب گذارش کرتا ہوں، کہ اگر ان روایات فقہیہ کی کسی قدر تفصیل، کہ جن سے ہندوستان کا دارالحرب ہونا معلوم ہوتا ہو، تحریر فرمائیں، اور ان روایتوں سے اس استدلال کے طریقہ کی بھی اطلاع بخشیں۔ اخلاق عالی سے [جو اخلاق نبوی کا گویا اک نمونہ ہیں] غیر متوقع نہ ہوگا۔

اور وہ روایات یہ ہیں:

خزانۃ المفتین میں ہے: دارالاسلام دارالحرب نہیں ہوتا، مگر اس میں شرک کے احکام جاری ہونے سے، یا یہ ہو کہ وہ شہر دارالحرب سے اس طرح مل جائے، کہ اس شہر اور دارالحرب کے بیچ میں مسلمانوں کا کوئی شہر باقی نہ ہو،

اور اس علاقہ میں کوئی مسلمان یا ذمی، پہلے معاہدہ کے مطابق، محفوظ و مامون نہ رہے۔ پس جب تک یہ شرطیں نہ پائی جائیں گی، تو یہ شہر دار الحرب نہ ہوگا۔

اور ہمارے اس قول کا، کہ اس میں کوئی مسلمان یا ذمی پہلے معاہدہ اور دستاویز امن کے مطابق، امن سے اور محفوظ نہ رہے، مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی ذات کی حفاظت کا یقین نہ ہو مگر مشرکین کی امان سے۔

اور [صاحبین نے] کہا ہے کہ جب دار الاسلام میں شرک کے احکام جاری ہو جائیں۔ تو وہ دار الحرب ہو جاتا ہے، چاہے وہ دار الحرب سے ملا ہوا ہو، یا نہ ہو، اس میں مسلمان اور ذمی پہلے امن اور امان کے معاہدہ کے مطابق ہوں یا نہ ہوں۔ اور دار الحرب دار الاسلام ہو جاتا ہے، اس میں اسلام کے احکامات جاری ہونے کے ذریعہ سے، اگرچہ پہلے وہاں سے اسلام کی شوکت ختم ہو گئی ہو۔ یہی شرح سیر ابی الیسر میں لکھا ہے۔

بلاشبہ دار الاسلام دار الحرب نہیں ہوتا، جب تک اس میں موجودہ سب باتیں، جن کی وجہ سے دار الاسلام ہوا تھا، ختم نہ ہو جائیں۔ کیوں کہ حکم جب کسی علت کی وجہ سے ثابت ہو تو جب تک یہ وجہ باقی رہے گی یہ حکم بھی باقی رہے گا۔

اور منثور میں ہے کہ: دار الاسلام، احکام اسلام جاری ہونے سے ہوتا ہے، جب تک اس میں اسلام کی علامتوں میں کوئی علامت باقی رہے گی، اس کی اسلام کی جانب نسبت کو ترجیح رہے گی۔

اور بزازیہ میں ہے: سید الامام نے کہا کہ وہ شہر جو آج کل کافروں کے قبضے میں ہیں، اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بلاد اسلام ہیں، کیوں کہ ان میں اہل کفر کے احکامات جاری نہیں، بلکہ مسلمان قاضی مقرر ہیں۔ اور وہ شہر جن پر غیر مسلم حکام کے نمائندے، بڑے افسر کی حیثیت سے متعین ہیں، تو ان میں بھی جمعہ کی نماز قائم کرنا، عید کی نماز پڑھنا، ٹیکس لینا، قاضیوں کی پیروی کرنا، بیواؤں کے نکاح کرنا درست ہے، اور وہ علاقے جس میں کافر حکام مسلط ہوں، تو ان میں بھی جمعہ قائم کرنا اور عیدین کی نمازیں پڑھنا جائز ہے۔ اور مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی مقرر کر لینے سے، قاضی ہو جاتا ہے۔

اور یہ واضح ہو گیا، کہ اگر کسی چیز کے حکم کی کوئی علت باقی ہو تو وہ حکم بھی باقی رہے گا، اور [ہمارے علماء نے] یہ بھی فیصلہ کیا ہے، کہ یہ علاقے تاتاریوں کے قبضے سے پہلے، دیار اسلام میں سے تھے، اور ان کے قبضہ کے بعد بھی جمعہ، جماعت کی نماز اور شریعت کے تقاضے اور فیصلے کے متعلق فتوے، کتابوں کی تعلیم ان کے کسی سربراہ کے کسی اعتراض کے بغیر چل رہی ہے، اس لئے یہ فیصلہ صادر کرنا کہ وہ دار الحرب ہیں، اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے، نہ درایۃً نہ روایۃً۔

اور نشہ والی چیزوں کی برملا خرید و فروخت، روپیہ چنگی اور ٹیکس وصول کرنا اور تاتاریوں کی قومی رسموں کے مطابق احکامات جاری ہونا، ایسا ہی ہے جیسا کہ بنی قریظہ کا، حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی مورتی (رکھنے) کی اجازت مانگنا، حالاں کہ وہ (مدینہ منورہ) اس کے باوجود بھی بلا شک وشبہ دارالاسلام تھا۔

اور کہا گیا ہے کہ (علاقے اور شہر) کفر کے احکامات جاری ہونے کی وجہ سے، دارالحرب ہو جاتے ہیں، جب کہ ان (شہروں) میں اسلام کے احکامات کے مطابق، کوئی حکم جاری نہ ہو، اور یہ کہ اس میں کوئی مسلمان اور ذمی مسلمانوں کے پہلے معاہدہ (اور اعلان) کے مطابق محفوظ نہ رہے۔ لہٰذا جب بھی یہ شرطیں پائی جائیں گی، تو وہ سب دارالحرب ہو جائے گا، لیکن اگر ثبوت اور شرائط میں اختلاف ہو، تو وہ دارالاسلام، اسی حکم (دارالاسلام ہونے) پر باقی رہے گا، یا اسلام کے پہلو کو احتیاطاً ترجیح دی جائے گی۔

اور عتابی کی شرح زیادات میں ہے: دارالاسلام دارالحرب ہو جاتا ہے، تین شرطوں (کے پائے جانے) سے

[اول] اس میں کافروں کے احکامات، علی الاعلان جاری ہو جائیں۔

[دوم] یہ ہے کہ یہ علاقہ دارالحرب سے ملا ہوا ہو، اور اس شہر اور دارالاسلام کے بیچ میں، مسلمانوں کے شہروں میں سے کوئی شہر واقع نہ ہو۔

[سوم] یہ کہ، اس میں کوئی مسلمان اور ذمی، پہلے امن (مسلمانوں کے دئے ہوئے معاہدہ کے مطابق) محفوظ اور مطمئن نہ ہو۔

پس یہ شرطیں اس لئے مقرر کی گئی ہیں، تا کہ (غیر اسلامی قوت اور غلبہ) کی مکمل اور اصل حیثیت معلوم ہو جائے۔ کیوں کہ دارالاسلام کے ان دونوں (پہلوؤں) سے جڑنے میں احتیاط کی جاتی ہے۔

طحطاوی کے حاشیہ درمختار میں، یہ ہے کہ:

(فقہاء کا قول) شرک کے احکامات برملا جاری ہوں، اور ان میں کوئی حکم اہل اسلام (کے اصول اور شریعت) کے مطابق، (یا اس کی روشنی میں) نہ ہو۔

ہندیہ (فتاویٰ عالم گیری) میں ہے:

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ، اگر اس میں مسلمانوں کے احکامات (وقوانین) جاری ہوں، اور اہل شرک کے (قوانین وہدایات) جاری نہ ہوں، تو وہ دارالحرب نہیں ہوگا۔

پس یہ شہر امام صاحب کی رائے کے مطابق، نہ صاحبین کی رائے پر دار الحرب نہیں ہوں گے، کیوں کہ (دارالحرب ہونے کے لئے) احکام اسلام کا بالکل ختم یا بے اثر ہونا ایسی شرط ہے، جس پر سب کا اتفاق معلوم ہوتا ہے، اور اس شرط کا (اس وقت) موجود نہ ہونا، ظاہر ہے۔ کیوں کہ ان علاقوں میں (مسلمانوں بادشاہوں کی ہدایات وقانون کے مطابق) بہت سے اسلامی ہدایات واحکامات، اب بھی (قانونا) باقی اور جاری ہیں۔

اور اگر یہ شہر جناب والا کی رائے کے مطابق دار الحرب ہوں، تو ان شہروں میں غیر مسلموں سے سود لینے اور کافروں سے رہن، لینے کا کیا حکم ہوگا؟ اور ان روایتوں کا شریعت کے قانون کے مطابق جو مقصد ہو، تحریر فرمائیں۔

اور دار الحرب کے دار الاسلام میں بدل جانے کی صورت میں، صرف چند اسلامی احکامات کا نافذ ہونا، کافی ہو، تو بہ ظاہر اس زمانہ میں پوری دنیا دار الاسلام ہوگی؟

والسلام خیر ختام

سعد آباد ضلع متھرا

۱۷رشعبان ۱۳۱۰ھ (۷رمارچ ۱۸۹۳ء)

....

....

ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے......؟

ترجمہ فتوی [یا مکتوب گرامی] حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

ترجمہ از نور الحسن راشد کاندھلوی

بندہ رشید احمد گنگوہی کی جانب سے

میرے کرم فرما مولوی سعید الدین صاحب آپ کی عنایات ہمیشہ باقی رہیں۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمائیں کہ ماہ رمضان المبارک میں، آپ کا خط، مسئلہ دار الحرب کی تحقیق کے لئے پہنچا تھا۔ کیوں کہ میری صحت ایک عرصہ سے کمزور چل رہی ہے، اور رمضان المبارک میں اس میں اضافہ ہو گیا تھا، اس لئے جواب لکھنے سے قاصر رہا، اس وقت جیسے بھی بن پڑے، جواب لکھتا ہوں۔

سنئے! کسی شہر (یا کسی ملک) کے دار الاسلام یا دار الحرب ہونے کا دارومدار، مسلمانوں کے غلبہ (قوت قاہرہ) یا کافروں کے غلبہ پر ہے، اور بس! لہٰذا ہر وہ جگہ جو مسلمانوں کے احکامات کے تابع ہے، اس کو دار الاسلام کہا جائے گا، اور ہر وہ جگہ جو کافروں کے احکامات کی پابند ہے، اس کو دار الحرب کا نام دیا جائے گا۔ جامع الرموز میں کہا ہے:

دار الاسلام وہ ہے جس میں امام المسلمین کے احکامات جاری ہوں، اور وہاں مسلمان امن کے ساتھ رہتے ہوں۔ اور دار الحرب وہ ہے، جس میں مسلمان غیر مسلموں سے خوف زدہ رہتے ہوں۔

رد المحتار اور شامی میں ہے۔

”قاری الہدایہ سے دریائے شور کے متعلق سوال کیا گیا، کہ وہ دار الحرب ہے یا دار الاسلام؟ جواب دیا کہ وہ ان دونوں سے جدا ہے، اس لئے کہ اس میں کسی کو بھی غلبہ حاصل نہیں ہے۔

اس عبارت کے نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ، کسی مقام کے دار الاسلام یا دار الکفر ہونے کا تمام تر دارومدار، کفر اور اسلام کے غلبہ پر ہے، اور بس! اگرچہ دیگر وجوہات کی بنا پر، دریائے شور کے متعلق، راجح قول اس کے دار الحرب ہونے کا ہوگا۔ اور ہر وہ جگہ جو دونوں فریق کی مقہور ہو، اس کو۔

[الاسلام یعلو ولا یعلی] اسلام غالب رہتا ہے مغلوب نہیں ہوتا۔

کے اصول کے مطابق، دارالاسلام کہیں گے، مگر اسی شرط پر کہ یہاں بعض پہلوؤں سے اہل اسلام کا غلبہ اور تسلط ہو، نہ صرف یہ کہ وہاں مسلمان رہتے ہوں، یا بعض شعائر اسلام کی کفار کی اجازت سے بجا آوری کی اجازت ہو، اس لئے کہ کسی خطے میں مسلمانوں کا آباد ہونا، یا وہاں غیر مسلموں کی اجازت سے شعائر اسلام کی بجا آوری کی اجازت ہونا، لائق اعتبار نہیں ہے۔

اسی طرح غیر مسلموں کا دارالاسلام میں (موجود) ہونا، اور وہاں کفریہ رسومات پر، اہل اسلام کی اجازت، یا ان کی کوتاہی وغفلت کی وجہ سے عمل پیرا ہونا، اس جگہ کے دارالاسلام ہونے کو، کچھ نقصان نہیں پہنچاتا۔ کیوں کہ دونوں میں سے کسی صورت میں بھی (دوسرے فریق کا) غلبہ نہیں ہوا، اور (دارالاسلام یا دارالحرب کا) فیصلہ، غلبہ کی وجہ سے ہے، نہ صرف موجود رہنے اور احکام الاسلام یا کفر ظاہر کرنے کی وجہ سے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ، ذمی، دارالاسلام میں مسلمانوں کی اجازت سے قیام پذیر رہتے ہیں اور اپنے مذہبی طور طریق کو برملا انجام دیتے ہیں۔ اس کے باوجود (اس خطے کا) دارالاسلام ہونا، جوں کا توں باقی رہتا ہے، اور مسلمان دارالکفر میں کافروں سے، معاہدۂ امن کی وجہ سے اطمینان سے آتے جاتے ہیں، اور اپنے اسلامی شعائر کو دارالکفر میں بے جھجک سرانجام دیتے ہیں، (مگر یہ امن) اس علاقے کے دارالکفر ہونے کو ختم نہیں کرتا۔

کیا آپ ملاحظہ نہیں فرماتے، کہ فخر عالم حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ایک بہت بڑے مجمع کے ساتھ، عمرۃ القضاء کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے، اور جماعت نماز وغیرہ جملہ شعائر اسلام کو وہاں کھل کر ادا فرماتے تھے، اور باوجود اس قدر وسیع جماعت کی موجودگی کے، کہ اس کے ذریعے مکہ میں کافروں کو خوف زدہ فرمائیں، چنانچہ حدیبیہ میں رفقاء کی کثیر تعداد کی بنا پر، مکہ معظمہ پر غلبہ کا ارادہ فرمالیا تھا، مگر کیوں کہ یہ سب کافروں کی اجازت کی وجہ سے تھا، اس لئے ان تینوں دنوں کے لئے مکہ دارالاسلام نہیں ہوا، بلکہ دارالحرب باقی رہا۔ اس لئے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں یہ قیام اور اظہار شعائر اسلام، کافران مکہ کی اجازت سے تھا، مسلمانوں کے اپنے غلبہ اور طاقت کی وجہ سے نہیں۔

بہر حال یہ طریقہ بحولہ بالا ایک قاعدہ کلیہ ہے، کہ دارالحرب، کافروں کے زیر تسلط علاقہ ہے اور دارالاسلام مسلمانوں کے تابع فرمان مملکت!۔ اگر چہ ایک کے علاقے میں دوسرے فریق کے افراد بھی، بلا کسی ظلم وزیادتی کے، آزادی سے رہتے ہوں، اور جس مقام پر دونوں فریقوں کو یکساں اختیارات اور قوت حاکمہ حاصل ہو، وہ بھی دارالاسلام سمجھا جائے گا۔

اس اصول کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہئے، اس لئے کہ اس موضوع کے جملہ مسائل اسی سے نکلتے ہیں، اور اس باب کی تمام جزئیات اسی اصول کے تابع ہیں۔ اس کے بعد ایک بات اور سن لیجئے، کہ ہر وہ جگہ جو دارالکفر ہو اور اہل اسلام اس پر اقتدار حاصل کر لیں، اور وہاں احکام اسلام جاری فرمادیں، اس کے متعلق علمائے اسلام ہی فرماتے ہیں، کہ وہ دارالاسلام

ہوگیا، کیوں کہ مسلمانوں کا اقتدار اور تسلط نافذ ہوگیا ہے۔ اگرچہ بعض صورتوں میں وہاں کافروں کا عروج واقتدار باقی ہو، مگر پھر بھی [الاسلام یعلو ولا یُعلیٰ] اسلام غالب رہتا ہے، مغلوب نہیں ہوتا، کے اصول کے مطابق، وہ جگہ باتفاق علمائے اسلام دارالاسلام ہوگئی ہے، جیسا کہ اوپر وضاحت کردی گئی۔

مکرر وضاحت کی جاتی ہے کہ، اگر اس خطے میں مسلمانوں کا داخلہ اور اسلام کا اظہار، مسلمانوں کے تسلط اور اقتدار کامل کے ذریعے نہ ہوا ہو، تو اس علاقے کے دارالحرب ہونے کے حکم میں، کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ ورنہ اس طرح صرف (مسلمانوں کی موجودگی سے) تو جرمن، روس (۱) فرانس وغیرہ عیسائیوں کی تمام حکومتیں، اور چین وغیرہ کافروں کے ملک دارالاسلام ہوجائیں گے، اور دنیا میں بھی کہیں دارالحرب کا نام ونشان باقی نہیں رہے گا۔ اس لئے تمام غیر مسلم ملکوں میں، مسلمان غیر مسلم حکومتوں کی اجازت سے، احکام اسلام پر عمل پیرا رہتے ہیں، اور ایسے ملکوں کو دارالاسلام کہنا، بدیہی طور پر غلط ہے۔

بہر صورت دارالاسلام اور دارالکفر کی تعیین میں، تسلط اور اقتدار معتبر ہے، اور بس! اور ہر وہ جگہ جو دارالاسلام تھی پھر غیر مسلموں نے وہاں تسلط حاصل کرلیا، تو اگر وہاں اسلام کا حکم اور اقتدار بالکل ختم ہوگیا ہو، تو وہ علاقہ دارالحرب ہوجائیگا، اور اگر کافروں کا تسلط ہو، لیکن بعض حیثیات سے مسلمانوں کو بھی غلبہ واقتدار حاصل ہو، اس کو دارالاسلام کہیں گے۔ نہ کہ دارالحرب، اس مسئلہ پر اتفاق ہے، مگر غلبۂ اقتدار بالکل ختم ہونے کی کیا حد ہے، اس میں ہمارے ائمہ فقہ کے درمیان اختلاف ہے۔

صاحبین فرماتے ہیں، کہ اگر دونوں فریق (اہل اسلام اور غیر مسلم) اپنے اپنے احکامات اور فیصلوں کو علی الاعلان جاری کرسکتے ہوں، تو غلبۂ اسلام بھی باقی ہے، اور اگر اہل اسلام اپنے احکامات کے نفاذ کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور اس میں غیر مسلموں کی اجازت کے پابند ہوں، تو کچھ بھی غلبہ اسلام باقی نہیں رہا (یعنی یہ ملک دارالحرب شمار ہوگا)۔

کیوں کہ جب کافر اس طرح مسلط ہوگئے، کہ کافرانہ احکامات پورے طور اور طاقت سے جاری کرنے لگے، اور اہل اسلام اس قدر عاجز اور مغلوب ہوگئے، کہ اسلامی احکامات نافذ نہیں کرسکتے، اور کافرانہ احکامات جو اہل اسلام کے لئے موجب شرمندگی اور عیب ہیں، ان کو ختم کرنے اور رفع کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، پس اسلام کا غلبہ کس درجہ میں باقی رہا، کہ (اب بھی) اس کو دارالاسلام کہا جائے؟ بلکہ کفار کا تسلط اور اقتدار پوری طرح ظاہر ہوگیا، اس لئے (وہ) اس وقت دارالحرب ہوگیا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا سو ہوگا، اس وقت اس کے دارالحرب ہونے میں کوئی کمی باقی نہیں رہی، اور یہ اس دارالحرب کی طرح ہوگیا، جس پر پرانے زمانے سے کافر مسلط ہیں، جیسا کہ ظاہر ہے۔

(۱) یاد رہے کہ حضرت مولانا گنگوہی کا یہ فتویٰ، شوال سنہ ۱۳۱۰ھ/اپریل ۱۸۹۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس وقت روس میں بادشاہت تھی، عیسائی حکومت تھی اور زار خاندان کی حکمرانی تھی، اس کے چھبیس سال بعد سنہ ۱۹۱۷ء میں کمیونسٹ انقلاب آیا تھا۔ [نور]

اور امام ابوحنیفہؒ نے باریک بینی اور استحسان کے طور پر فرمایا ہے کہ، دارالاسلام کو دارالکفر کا حکم دینے میں، اس وقت تک احتیاط کرنی چاہئے، جب تک کہ وہاں غلبہ اسلام کے نشانات میں سے، کچھ بھی اثر باقی ہو، یا کافروں کے قبضے اور تسلط میں کچھ کمزوری پائی جاتی ہو، اور ان کے تسلط (واحکامات) کو رد کرنا، مسلمانوں پر زیادہ مشکل نہ ہو۔ مگر اس پر دو شرطیں اور اضافہ فرمائی ہیں۔

ایک تو یہ کہ وہ شہر اور بستی، جس پر کفار قابض اور متسلط ہیں، دارالحرب سے اس طرح ملا ہوا ہو، کہ اس علاقے اور دارالحرب کے درمیان دارالاسلام کا کوئی علاقہ، اس طرح حائل نہ ہو، کہ اس علاقے اور دارالحرب سے ملنے کی وجہ سے، اس کو دارالاسلام سے دوری ہو جائے، اور کافروں کے حلقہ میں آجائے۔ نیز کافروں کا غلبہ اس مضبوطی کے ساتھ ہو کہ اس کا کافروں کے ہاتھ سے خالی کرالینا سخت دشوار ہو جائے، اور اس مقام کے رہنے والے مسلمانوں پر، کافروں کا تسلط کمال کو پہونچ جائے۔ اور اس کی مثال یہ ہے، کہ جیسے کہ کافر مسلمانوں کے مال پر قبضہ کر لیں، اگر وہ مال ان (کافروں کے ملک یا علاقے) میں پہنچ گیا، تو ان کی ملکیت ہو گیا، اور اگر اس قبضہ کے بعد (بھی) ان کے خاص علاقے میں نہیں گیا، تو اس کو اصل مالک کی ملکیت سے نکل جانا، تسلیم نہیں کیا جاتا، جیسا کہ فقہ کی تمام کتابوں میں یہ مسئلہ طے شدہ (واضح) ہے۔..... ہدایہ میں کہا ہے:

اور جب (غیر مسلم) ہمارے مال پر، قابض ہو جائیں اور اس کو اپنے علاقہ میں لیجائیں، تو وہ اس کے مالک ہو جائیں گے۔

اسی [ہدایہ] میں یہ بھی ہے:

لیکن یہ قبضہ تسلیم نہیں ہوتا، جب تک وہ اس دولت کو اپنے علاقہ میں نہ لیجائیں، کیوں کہ قبضہ کا حاصل یہ ہے کہ اس چیز پر اس وقت بھی قبضہ ہو اور وہ قبضہ آئندہ بھی باقی رہ سکے، پس اسی طرح کوئی زمین یا علاقہ، مثلا کافروں کے تسلط میں آگیا، اگر ان کا یہ قبضہ اور تسلط ایسا مکمل ہو گیا، کہ وہ شہر یا علاقہ بلاد کفر میں مل گیا، اور یہ قبضہ اس زمین کے دارالحرب سے، علاقائی طور پر بھی ایک ہو گیا اور دار کفر سے مل گیا اور دارالاسلام سے کٹ گیا، تو گویا یہ شہر غیر مسلموں کے ہاتھوں میں مکمل دب گیا، اور بے حیثیت ہو گیا، تو [یہ دارالحرب ہے] ؟ ورنہ دارالاسلام باقی ہے۔ اگر چہ اس کا دارالاسلام ہونا کمزور درجہ کا ہے، لیکن الاسلام یعلو ولا یعلی (اسلام سربلند رہتا ہے، پست اور کمزور نہیں ہوتا) کی ہدایت کے مطابق یہ دارالاسلام ہونا چاہئے، اس شرط کا حاصل بھی وہی اہل کفر کا غالب ہونا اور اہل اسلام کا مغلوب ہونا ہے، جو شروع میں بنیادی اصول اور کلیہ بیان کیا گیا ہے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ وہ امان جو مسلمان حاکم نے مسلمانوں کو ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے، اور غیر مسلم

رعایا کو ذمیتی کے معاہدہ کی وجہ سے دی تھی، ختم ہوجائے، اس طرح ختم ہوجائے کہ کسی بھی شخص کو اپنے مال اور ذات کی حفاظت کا اطمینان باقی نہ رہے۔ یعنی جیسے کہ مسلمان حاکم کے امن دینے (اعلان کرنے) کی وجہ سے، ہمیشہ محفوظ تھے کہ حاکم کے امن کیوجہ سے یہ خیال نہیں، کہ کسی مسلمان یا ذمی کی جان یا مال کو کوئی خطرہ ہوگا، یہ خطرہ اسی وقت ہوسکتا ہے، جب مسلمان حاکم کو شوکت اور غلبہ حاصل نہ ہو، جب یہ امان باقی نہ رہی، کہ کوئی شخص بھی اس امان کی وجہ سے محفوظ نہ رہا، یعنی یہ امان بے وقعت اور بے اثر ہوگئی اور جو امان کہ غیر مسلموں نے دی ہے، وہی امن پر اطمینان کا ذریعہ ہے۔

پس ظاہر ہے کہ جب تک مسلم حاکم کے ڈر کی وجہ سے تکلیف پہنچانے والے کو ڈر رہے گا، تو مسلمانوں کے امن کا غلبہ اور اس کی شوکت (کسی قدر) باقی رہے گی، اور جب یہ چیز نہ رہے گی بلکہ (مسلمان حاکم کا دیا ہوا) امن کمزور ہوجائے گا، پہلا (اسلامی) امان ختم ہوجائے گا۔

لہٰذا حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک، جب کسی علاقہ میں کافروں کے علی الاعلان احکامات جاری ہونے کے بعد، یہ دونوں شرطیں پائی جائیں گی، کفر کا ہر پہلو سے غالب ہونا ثابت ہوجائے گا، اور اسلام کا ہر پہلو سے غلبہ ختم ہوجائے گا، اس وقت آزادی میں سے کچھ باقی نہیں رہا، لہٰذا اس علاقہ کے دارالحرب ہونے کا حکم دیا جائے گا۔

اہل دانش کو اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس بات کا مدار بھی قہر وغلبہ پر ہے، اور بس! جو کہ شروع میں اصل کلی میں واضح کردیا ہے۔

اس تقریر کے بعد روایات فقہاء کو سننا چاہئے، کہ ان میں سے بعض کے نقل کرنے سے، اس ناچیز کی تقریر کی سند حاصل ہوجائے گی، اور بعض کے معلوم ہونے سے، اس سلسلہ کی تمام روایتیں معلوم ہوجائیں گی۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں لکھا ہے کہ، امام محمد نے زیادات میں فرمایا ہے:

بلاشبہ، امام ابوحنیفہ کے نزدیک تین شرطوں کے پائے جانے سے، دارالاسلام دارالحرب ہوجاتا ہے۔

اول یہ ہے کہ عام طور سے [علی الاعلان] کفر کے احکامات جاری ہوجائیں، اور اس میں اسلام کے مطابق کوئی قانون وضابطہ (جاری اور) زیر عمل نہ ہو۔

دوسرے: یہ کہ وہ اس طرح دارالحرب سے ملا ہوا ہو، کہ ان دونوں کے بیچ میں، بلادِ اسلام میں سے کوئی بستی اور شہر واقع نہ ہو۔

تیسرے: یہ کہ اس علاقہ میں کوئی مسلمان اور ذمی، پہلے معاہدہ اور معاملہ کے مطابق محفوظ و مامون نہ رہا ہو، اس

معاہدہ کے مطابق، جو (اس علاقہ پر) کافروں کے غلبہ سے پہلے، مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی وجہ سے اور ذمیوں کو عہد و پیمان کی وجہ سے حاصل تھا۔ اب مسئلہ کی ترتیب تین طرح سے ہے:

الف: حربی ہمارے شہروں میں سے کسی شہر پر غالب آجائیں۔

ب: اہل شہر اپنے دین سے پھر جائیں، اور اس شہر میں اہل کفر غالب ہو جائیں، اور ان کے احکامات جاری ہو جائیں اور ان ہی کا غلبہ ہو جائے۔

ج: یا اہل ذمہ اپنے معاہدہ کو توڑ دیں، اور ہمارے شہروں پر غالب ہو جائیں۔

تو ان تمام صورتوں میں سے کسی ایک شکل، یا تمام (معاملات پائے جانے کے بعد بھی) یہ شہر دار الحرب نہیں ہوں گے، مگر تین شرائط کے ساتھ: امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے، کہ صرف ایک شرط کے ساتھ، اس کے علاوہ کوئی شرط نہیں ہے، وہ احکام کفر کا ظاہر و غالب [ونافذ] ہونا ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں، اور یہی قیاس بھی ہے۔

جامع الرموز میں کہا ہے: اور اس (دار الاسلام) کا دار الحرب ہو جانا (امام ابو حنیفہؒ) کے نزدیک چند شرائط کے ساتھ ہے۔

ایک کھل کر برملا احکامات کفر کا جاری ہونا، ایسا کہ حاکم کافر کی طرف رجوع کرنا ہو اور مسلمان قاضی سے کوئی معاملہ نہ ہو [جیسا کہ بحر الرائق میں ہے]۔

دوسرے: اس کا دار الحرب سے، اس طرح ملا ہوا ہونا، کہ ان دونوں دار الحرب اور دار الاسلام کے شہروں کے بیچ میں کوئی اور ایسا اسلامی شہر واقع نہ ہو، جو دار الاسلام کو دشمنوں کے حملے سے بچائے اور حفاظت کرے۔

جامع الرموز کی اس عبارت سے دو باتیں واضح ہوئیں:

﴿الف﴾ ایک تو یہ کہ اہل اسلام کا حکم جاری ہونے کا مطلب اظہار حکم اسلام ہے، غلبہ کے طور پر، نہ صرف جماعت اور جمعہ [وغیرہ] کی اجازت ہونا۔ کیوں کہ مصنف جامع الرموز کہتا ہے: کہ، غیر مسلموں کے احکامات کے مطابق فیصلے کئے جائیں اور مسلمان قاضیوں کی جانب رجوع نہ کیا جائے، یعنی مسلمان قاضیوں کی کچھ شوکت اور وقعت باقی نہ رہے، کہ ان سے رجوع کیا جائے۔ اور اسی طرح مسلمانوں کے لئے دار الحرب میں حکم جاری ہونے کا مطلب، ان کے حکم کا غلبہ ہونا مراد ہے، جیسا کہ ظاہر ہے۔ بہر حال حکم اسلام ظاہر ہونے اور حکم کفر ظاہر ہونے سے مراد قوت اور غلبہ ہے۔ نہ صرف [بعض معاملات کے] ادا کرنے کی اجازت، اور ان کے ظاہر کرنے کی گنجائش پر، یہ فیصلہ نہ ہوگا۔

﴿ب﴾ یہ کہ اتصال اور انقطاع کی شرط کا حاصل بھی، وہی قوت ہے کہ جس کی وجہ سے دار الحرب کے اتصال کی

صورت میں، حربیوں سے مغلوب شہر کو مدد نہ پہنچے۔ بخلاف دار الحرب سے انقطاع کے (کہ اس وقت اہل اسلام سے) مدد کا پہنچنا ہوسکتا ہے، پس (گویا) ابھی قوت اسلام باقی ہے۔

خزانة المفتين میں ہے: دار الاسلام دار الحرب میں (تبدیل) نہ ہوگا، مگر اس میں شرک کے احکام جاری ہونے کی وجہ سے، اور اس وجہ سے کہ وہ (دار الاسلام) دار الحرب سے، اس طرح مل جائے، کہ اس دار الاسلام اور دار الحرب کے بیچ میں مسلمانوں کا کوئی شہر واقع نہ ہو، اور اس میں کوئی مسلمان اور ذمی امان اول (جو پہلے حاکم مسلم سے حاصل تھا) کے ذریعہ محفوظ اور پر امن نہ ہو۔ پس جب تک یہ شرائط نہ پائی جائیں اس وقت تک دار الاسلام دار الحرب میں (تبدیل) نہ ہوگا۔

اور ہمارے ان الفاظ: لايبقى فيها مسلم أو ذمي آمنا بالأمان الأول کا مطلب یہ ہے، کہ اس علاقہ میں کوئی مسلمان اور ذمی، اپنی جگہ محفوظ نہ ہو، مگر مشرکین کے دیئے ہوئے امن وامان کی بنیاد پر۔

اور بزازیہ میں ہے سید الامام ( ) نے فرمایا: وہ شہر اور علاقہ جو کافروں کے ہاتھوں میں ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ بلاد اسلام ہے، کیوں کہ اس میں کافروں کے احکامات نافذ نہیں، بلکہ مسلمان قاضیوں کے احکامات پر عمل ہے۔

پس دیکھنا چاہئے کہ، ان شہروں کے دار الاسلام ہونے کے ثبوت میں، یہ لائے ہیں: بل القضاة مسلمون یعنی وہاں ان قاضیوں کی ہدایات اور اسلام کے احکامات، اسی طرح نافذ ہیں، جس طرح شروع میں تھے۔ یہ نہیں کہا کہ وہ اس لئے دار الاسلام ہیں، کہ وہاں لوگ نماز پڑھتے ہیں اور جمعہ کی نماز (جماعت سے) ادا کرتے ہیں۔ کیوں کہ اجرائے احکام سے شوکت وغلبہ مراد ہے، نہ سرکاری ملازمین وحکام کی اجازت سے، مراسم دین کی ادائیگی۔

در مختار میں کہا ہے:

معراج الدرایہ میں مبسوط سے نقل کیا ہے کہ: وہ شہر جو کافروں کے تسلط میں ہیں، وہ بلاد اسلام ہیں، دار الحرب نہیں ہیں، کیوں کہ ان میں کفر کے احکامات ظاہر نہیں ہوئے، بلکہ وہاں [بدستور] قاضی اور مسلمان حکام ہیں، لوگ اپنی ضرورتوں اور اس کے علاوہ معاملات میں بھی، ان ہی کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور ہر وہ شہر جس میں حربیوں کی طرف سے حاکم مقرر ہوں، وہاں حاکم مسلم کے لئے جمعہ وعیدین قائم کرانا اور اجراء حد اور قاضی کا تقرر جائز ہے۔ ان حربیوں پر بھاری پڑنے کی وجہ سے۔ پس اگر حاکم غیر مسلم بھی ہوں، تو مسلمانوں کے لئے جمعہ قائم کرنا جائز ہے اور قاضی مسلمانوں کے مقرر کرنے سے قاضی ہوجاتا ہے، اور مسلمانوں کے لئے واجب ہے، کہ وہ مسلم حاکم کے لئے کوشش کریں۔

اوراسی (درمختار) میں ہے۔ میں کہتا ہوں، اوراس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ ملک شام میں، جبل تیم اللہ اوراس سے ملحق بعض علاقے، سب بلاد اسلام ہیں، کیوں کہ اگرچہ ان شہروں کے حاکم دروز اور نصاریٰ ہوتے ہیں، اوران کے فیصلے اپنے مذہب کے مطابق ہوتے ہیں، اوران میں سے کچھ علی الاعلان اسلام کو برا بھلا کہتے ہیں، لیکن وہ (عموماً مجموعی طور پر) ہمارے حکام کی ماتحتی میں ہیں، اور اسلامی شہران کی بستیوں کا، ہر طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہیں، اور مسلم حکام جب ان کے متعلق، اپنے احکامات نافذ کرنا چاہیں، کرسکتے ہیں۔

ان دونوں روایتوں سے واضح ہے، کہ کسی علاقہ پر کافروں کے غلبہ کے بعد، اس کا دارالاسلام کی حیثیت سے باقی رہنا ،وہاں مسلمان حکام کی قوت وشوکت کا باقی رہنا، اور اسلامی قوانین اور احکامات کا غلبہ اور قوت کے ساتھ نافذ ہونا، مراد ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر دارحرب میں، اسلامی احکام اگر قوت (وطاقت) سے جاری ہوں، تو یہ اس کے دارحرب ہونے کو ختم کرنے والا ہوگا، صرف ان غیر مسلموں کے مخالف اسلام، حاکم کی اجازت اور خوشنودی سے، شعائر اسلام کے ادا کرنے کی اجازت سے، دار اسلام نہ ہوگا۔

حاصل یہ کہ مقصد ان شروط مذکورہ بالا سے، امام صاحب کے نزدیک اور شرط واحد اجراء حکم اسلام سے، صاحبین کے نزدیک وہی اہل اسلام کا غلبہ اور قوت وشوکت ہے، اگرچہ یہ قوت وشوکت جزوی طور پر ہو۔ کوئی فقیہ نہیں فرماتے کہ کافروں کے ملک میں، اگر کوئی شخص ان (کافروں) کی صراحۃً یا دلالۃً اجازت سے، شعائر اسلام ظاہر کرتا ہے، [ان پر عمل کرتا ہے] تو اس سے وہ ملک دارالاسلام ہو جاتا ہے، ہرگز نہیں! اس لئے یہ بات فقہ وتفقہ سے دور ہے۔

جب یہ مسئلہ واضح ہوگیا، اب ہندوستان کے حال پر غور فرمائیں، کہ یہاں کافروں اور عیسائیوں کے احکامات کس قوت اور غلبہ کے ساتھ ہیں! اگر ادنیٰ کلکٹر بھی حکم دیدے، کہ مسجدوں میں جماعت کی نماز ادا نہ کریں، کوئی شخص غریب امیر اس کی ہمت نہیں رکھتا، کہ نماز ادا کرسکے۔ اور یہ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا ادا ہونا اور فقہی طور پر، ان کی ادائیگی کا حکم ہو جانا، صرف ان (انگریزوں وغیرہ) کے قانون کی وجہ سے ہے، کہ انہوں نے رعایا کے لئے یہ حکم جاری کر رکھا ہے، کہ ہر شخص اپنے دین کے مطابق عمل کرے، سرکار کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں، اور سلاطین اسلام کا دیا ہو، جو امن تھا، اس کا تو اب نام ونشان بھی باقی نہیں۔ کون عقل منداس کو مانتا ہوگا کہ وہ امن (اور اجازت) جو شاہ عالم نے دیا تھا، ہم اب بھی اس معاہدۂ امن کے تحت آرام سے بیٹھے ہیں، بلکہ یہ (ایک) نیا ضابطۂ امن ہے، جو کافروں سے حاصل ہوا ہے، اور اسی امن (وانتظام) کے تحت، تمام قومیں ہندوستان میں قیام پذیر ہیں۔

جہاں تک [ایسے علاقے کا] دارالاسلام سے ملے ہوئے ہونے کا تعلق ہے، تو یہ ملکوں اور بڑے علاقوں میں شرط نہیں،

بلکہ چھوٹی بستیوں اور شہروں کے لئے یہ شرط کی گئی ہے۔ اور مدد ملنے سے سہولت سے مدد ملنا مراد ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر کابل کے حکمراں کی یا خلیفۃ المسلمین [ترکی] کی مدد آ جائے تو مسلمان کافروں کو ہند سے نکال دیں گے، ہرگز نہیں۔ بلکہ ان کا نکال دینا بہت دشوار ہے، مستقل جہاد و جنگ، اور بہت سامان (و انتظامات) کو چاہتا ہے۔ بہر حال کافروں کا ہندوستان پر تسلط اس درجہ کا ہے کہ، کسی وقت بھی کافروں کو دار حرب پر، اس سے زیادہ تسلط (اور قبضہ) نہیں ہوا [جیسا یہاں ہے] اور یہاں مراسم اسلام کا ادا کرنا، صرف ان کی اجازت سے ہے، اور (ہندوستان میں) مسلمانوں سے زیادہ کمزور بے بس، ان کی رعایا میں کوئی نہیں ہے، کہ ہندوؤں کو بھی کسی قدر اعتبار حاصل ہے، مگر مسلمانوں کی کچھ وقعت نہیں ہے، ہاں البتہ ٹونک، رامپور اور بھوپال وغیرہ میں، کہ وہاں کے حاکم [نواب] کافروں کے احکامات سے دبے ہوئے ہونے کے باوجود، اپنے احکامات جاری رکھتے ہیں۔ اس لئے ان ریاستوں اور مقامات کو، دار الاسلام کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ در مختار وغیرہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔

اب بعد سلام مسنون! یہ ہے کہ، اگر اس تحریر سے آپ کو اطمینان حاصل ہو جائے تو مراد حاصل ہے، ورنہ بندہ کو معذور سمجھیں۔ چوں کہ میں لمبی تحریر سے معذور ہوں، (اس لئے) اسی مسودہ کو (آپ کے پاس) بھیجتا ہوں، امید کہ نقل کے بعد اس کو (واپس) بھیج دیں گے، کیوں کہ بعض لوگ یہاں بھی اس کی نقل کا ارادہ رکھتے ہیں۔

فقط والسلام

۷/ شوال ۱۳۱۰ھ (۲۴/ اپریل ۱۸۹۳ء)